صفا

۱۱

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

جامعہ اسلامیہ

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

مدیر اعلیٰ
محمد رضوان القاسمی

مدیر
خالد سیف اللہ رحمانی

شمارہ
۱۱

صفر ○ ربیع الاول ○ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

مطابق: • اکتوبر • نومبر • دسمبر ۱۹۹۰ء (۱۹۹۰)

ناشر: شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم سبیل السلام

پوسٹ بالاپور، حیدرآباد ۵.....۵ انڈیا

فون نمبر: ۲۳۹۴۵۰

فہرستِ مضامین

سہ ماہی "صفا" کی خریداری قبول فرما کر
دین دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیں

○ زرِ سالانہ : ‎-/40 روپے
○ معاون خصوصی : ‎-/100 " "
○ فی پرچہ : ‎-/10 " "

نوٹ : افتتاحیہ میں جن مضامین کا ذکر کیا گیا ہے، افسوس کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے ان میں سے بعض مضامین شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔ انشاء اللہ آئندہ خصوصی شمارہ کے بعد والے شمارہ، جو چودھواں (۱۴) شمارہ ہوگا، میں قارئین ان مضامین کو ملاحظہ فرما سکیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

"ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!"----- علامہ اقبال کا یہ مصرعہ جس قدر زبان زد عام و خاص ہے۔ اسی قدر اس شعر کی معنویت بھی زندہ اور مشاہد ہے۔ لیکن بر صغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں ادھر جو مسلسل اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو سیاسی پیش گوئی کرنے والوں کے لئے نہایت حیران کن ہے۔ ہندوستان میں ابھی ایک سال پہلے کانگریس کا زوال ہوا اور حزب اختلاف کے اتحاد سے نئی حکومت وجود میں آئی۔ لیکن بی۔ جے۔ پی کے مذہب کے سیاسی استعمال بلکہ استحصال نے بالآخر اس حکومت کو گرا کر ہی دم لیا اور کانگریس نے ٹھیک اسی طرح وزارت عظمیٰ کے لئے بے چین سیاستداں چندر شیکھر کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا۔ جیسا کہ وہ اس سے پہلے چرن سنگھ کے ساتھ کر چکی تھی۔ اور اب موجودہ حکومت کی کانگریس کے ساتھ وہی نسبت ہے کہ "بیان ان کا ہے زبان میری ہے"۔

صورت حال یہ ہے کہ بی۔ جے۔ پی کی زہر افشاں تقریروں، تحریروں اور یاتراؤں نے چند علاقوں کو چھوڑ کر پورے ملک کو ایسے فرقہ وارانہ جنون میں مبتلا کر دیا ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد سے آج تک اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تمام سیاسی جماعتیں ہیں کہ اس صورت حال کی مذمت کرتی ہیں اور سیکولرازم کا نعرہ بلند کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو کوشاں ہیں لیکن کسی ہاتھ میں یہ قوت نہیں کہ وہ عملاً فرقہ پرستی کے اس عفریت کا مقابلہ کرے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فرقہ پرست طاقتیں اپنے مخالف سیکولرازم نعروں کا سیاسی استعمال کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سیکولرازم کا نعرہ لگانے والے بھی اپنے نعروں کا محض انہیں جیسے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ غرض "عبارا تناشتی وحسنک واحد"۔

ان حالات نے جہاں شمالی ہند کے مختلف شہروں کو فسادات کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جنوبی ہند کے معروف اور مرکزی شہر حیدرآباد کو بھی نہ چھوڑا اور ایسا خونیں فساد برپا ہوا کہ اس شہر کی مثالی گنگا جمنی تہذیب کے لئے یہ بالکل ناقابل تصور تھا۔۔۔ ان حالات و واقعات نے اہل ضمیر کو تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ کاش! ان مفادات حاصلہ کے پاس بھی ضمیر ہوتا!!

اسی صورت حال کو سامنے رکھ کر راقم سطور نے اردو کے معروف اخبار "سیاست"۔ حیدرآباد ۲۴۔ ڈسمبر سنہ ۱۹۹۰ کے ذریعہ اپنا پیغام محبت باشندگان ہند کے لئے پیش کیا ہے، جو

۲۸ نکات پر مشتمل ہے، ان میں سے چند اہم نکات یہ ہیں---

۱۔ مذہبی پیشواؤں، قائدین اور مصلحین کے ایسے مضامین اور ملفوظات کی اشاعت عمل میں لائی جائے جن سے باہمی منافرت کم ہو، آپسی محبت پروان چڑھے اور مذہبی رواداری کا جذبہ فروغ پائے، تاہم مذہبی رواداری کے واقعات کچھ اس طرح بیان نہ کئے جائیں جس سے "وحدت ادیان" اور دین الٰہی کا تصور ابھرے، کیونکہ پچھلے زمانہ میں یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور تاریخ اسے رد کر چکی ہے، ہر مذہب کی اپنی شناخت اور اس کی مستقل حیثیت ہے جس کی بقا فطری اور قدرتی ہے، اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "مذہبی رواداری" کے واقعات کا تذکرہ ہی دراصل اپنے مذہب اور دین و دھرم کے ساتھ انصاف ہے۔

۲۔ کسی مذہبی کتاب کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا ظاہر بین نگاہ میں وہ بات عدل و انصاف، انسانی بھائی چارگی اور رواداری کے خلاف معلوم ہو، تو بطور خود معنی و مفہوم متعین کرنے کے بجائے مذہبی علماء کی طرف رجوع کیا جائے اور اس سلسلے میں انہیں کی تفہیم و تشریح کو صحیح اور معتبر مانا جائے، اس حقیقت پسندانہ طرز عمل سے بہت سارے شکوک و شبہات دفع ہو سکتے ہیں اور یہ تعمیری ذہن بن سکتا ہے کہ ایسی کسی بات کو تاریخی پس منظر اور سیاق و سباق کو سامنے رکھے بغیر حقیقی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

۳۔ یوم آزادی (۱۵ اگست ۱۹۴۷) کو ہندوستان کی تاریخ میں اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دن جو عبادت گاہ جیسی تھی، وہی حیثیت اس کی برقرار رکھی جائے، یہ فارمولہ ہندوستان کے بعض بزرگ سیاست دان بہت پہلے پیش کر چکے ہیں اب کسی نئے فارمولے کی تلاش، منزل کو دور کرنے پیچیدگیاں بڑھانے اور تضییع اوقات کے مماثل ہے۔ اس وقت کسی عبادت گاہ کے مسئلہ کو از سر نو ابھارنا اور اپنے تئیں ایسی فہرست مرتب کر کے شائع کرنا جس میں بعض مسجد اور مندر کی موجودہ حیثیت کو چیلینج کر کے سابق میں اسے ایک دوسرے کی جگہ پر بتانا یہ ملک کی خدمت نہیں، بلکہ بدخدمتی ہے۔ اور یہ جذبہ مذہبی نہیں خالص سیاسی ہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ عقل صحیح اور فہم سلیم سے کام لیا جائے اور شیخ سعدی رح کی اس حکیمانہ بات پر توجہ دی جائے کہ "فتنہ انگیز سچ سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے"۔

۴۔ جو لوگ غنڈہ گردی، دہشت گردی، اشتعال انگیزی، فتنہ پروری اور قتل و غارت گری میں ملوث ہوں ان کو بے نقاب کیا جائے۔ ایسے مجرمین کے لئے "خصوصی عدالت" ہو جس میں ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں عبرت ناک سزا دی جائے، ایسے لوگوں کی سزا میں نرمی یا چھوٹ کا مطلب جرم میں شریک ہونا ہے اور حاکم منصف اور محافظ ہی اگر جرم پر پردہ ڈالے، یا وہ مجرم بن جائے، تو ایسے معاشرہ اور ماحول کا خدا ہی حافظ ہے---

۴۔ نصابی کتابوں میں جو مواد خلاف واقعہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مغایر ہے۔ اسے فوراً حذف کر دیا جائے۔

ڈاکٹر، انجینیئر، عقلاء، اور اساتذہ، خصوصیت کے ساتھ اپنے پیشہ کو ہر تعصب اور تنگ نظری سے پاک رکھیں اور عمومی فلاح و بہبود کے کام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مساعی میں پیش پیش رہیں، نیز ہندوستانی باشندوں میں، یہاں کے جمہوری نظام کی اہمیت اور عدلیہ کی برتری کا احساس شدت سے پیدا ہونا چاہئے۔

۶۔ آج کی دنیا میں "ذرائع ابلاغ"۔ (ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات وغیرہ) کی بڑی اہمیت ہے اچھا اور خراب ذہن بنانے میں یہ بہت اہم رول ادا کرتے ہیں ---- یہ ذرائع جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں انہیں باریک بینی کے ساتھ اس پر نظر رکھنی ہوگی کہ کسی پروگرام مواد اور اس کے انداز اور ترتیب سے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کو ہوا تو نہیں مل رہی ہے اور اس کے نتائج کیا برآمد ہونے والے ہیں۔

۷۔ صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت حقیقت پسندی، دیانت اور وسیع النظری ہے لیکن ہندوستان کے جرائد اور اخبارات ان صفات سے محروم ہیں اور وہ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے شکار ہیں اس معاملہ میں کوئی اصول اور ضابطہ اخلاق ہونا چاہیئے تاکہ صحافت تعمیری کام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے استحکام میں بھرپور مدد دے سکے۔

۸۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ایک عرصہ سے بعض قائدین کی جانب سے بین فرقہ جاتی "امن فورس"۔ کے قیام، پولیس اور فورس میں ہر فرقہ کی مناسب نمائندگی، اور تشدد اور فساد کی صورت میں "اجتماعی جرمانہ"۔ کی تجاویز پیش کی جاتی رہیں، لیکن ہوا یہ کہ "عرضی پہونچ کر دفتر شاہی میں رہ گئی"۔ اس طرح کی تجاویز پر بعجلت ممکنہ عمل کرنے کی ضرورت ہے، اس پر بھی نظر رہے کہ ہندوستان میں بالفرض کسی ایک ہی فرقہ کے لوگ ہوں تو ان کے درمیان تو اور بھی بھیانک تصادم کا خطرہ ہے، اس لئے تمام فرقوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے ہی میں اجتماعی فائدہ ہے، کاش اس نکتہ پر خوب اچھی طرح غور کیا جاتا! ---

۹۔ مغربی جمہوریت اور ہندوستانی جمہوریت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب میں عام طور پر انتخاب میں اشخاص اور افراد کی گذشتہ خدمات، تعلیمی لیاقت اور سیاسی بصیرت وغیرہ پر نظر رکھی جاتی ہے جب کہ انتخاب میں ہندوستانی باشندوں کا یہ مزاج نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اسمبلی اور پارلمنٹ میں جو افراد منتخب ہو کر آتے ہیں، ان میں سے اکثر کو اپنی رکنیت، شہرت دولت، منصب و اقتدار اور اقرباء نوازی سے دلچسپی ہوتی ہے اور دل کش انتخابی منشور اور ملک و قوم کی خدمات اور ان کی ترقی کا خیال انہیں نہیں آتا۔ اور نہ ہی صحیح اصول اور بنیادوں پر فرقہ وارانہ ہم

آہنگی کے لئے وہ کام کرتے ہیں بلکہ اس کے بر عکس بسا اوقات وہ فرقہ واریت کا زہر گھولنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ سوچئے! کہ کس قدر گندی اور قابل نفرت اور لائق مذمت ہے وہ سیاست، کہ جس میں لوگوں کی گردن کو پل بنا کر اقتدار، عہدہ اور کرسی تک پہونچایا جاتا یا اسے باقی رکھا جاتا ہے اور اپنی "انا" کی تسکین کی خاطر وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جس سے جنگل کے درندوں اور پھاڑ کھانے والے جانوروں کو بھی شرم آئے!!

۱۰۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے آخری ضروری بات یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے لوگ افواہ پر کان نہ دھریں، کسی بھی نزاعی مسئلہ میں دو بدو بات چیت مفاہمت، مصالحت اور تحقیق حال کے طریقوں کو اپنائیں۔ ضد اور تعصب اور ہٹ دھرمی سے باز آئیں۔ صبر و ضبط اور تحمل و برداشت کی قوت کو بڑھائیں، ملک اور قوم کے دشمنوں، امن و سکون کے غارت گروں اور سماج اور سوسائٹی کے غنڈوں سے پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرکے ان کے ناپاک عزائم اور مذموم حوصلوں کو پست کریں۔

بابری مسجد کے مسئلہ پر ہر چند کہ گفتگو جاری ہے لیکن وشو ہندو پریشد، نے جو زبان اور طریق استدلال اختیار کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلیل و تحقیق کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں چاہتے، بلکہ محض جذبات اور "بھاوناؤں" سے مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہمیشہ جبر و طاقت اور ظلم و جور کے فلسفہ پر یقین رکھنے والوں نے کیا ہے، یہ ایسا تصور ہے جو ہندوستان کے سیکولرازم کو تباہ کرکے رکھ دے گا اور کوئی طاقت ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہ بچا سکے گی ----- اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود ہندو مورخین اور محققین نے شہادت دی ہے کہ کسی مندر کو گرا کر مسجد تعمیر کرنے کی بات بالکل خلاف واقعہ اور تاریخی اعتبار سے غیر ثابت شدہ ہے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم، سابق ناظم دارالمصنفین، مدیر "معارف" اعظم گڑھ نے اس قضیہ پر اتنا سارا مواد جمع کر دیا ہے کہ چشم حقیقت بین کے لئے کافی ووافی ہے، مگر یہ سب کچھ ان لوگوں کے لئے ہے جو مسئلہ کو الجھانا نہیں سلجھانا چاہتے ہوں، اور جذبات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ حقائق و واقعات کی بنیاد پر کسی بات کو طے کرنے کے لئے آمادہ ہوں---- خدا کرے اس قضیئہ کا کوئی باوقار اور منصفانہ حل نکل سکے۔

خلیج کے موجودہ حالات نے اس وقت مسلمانوں کو جس طرح بے سکون کرکے رکھ دیا ہے۔ وہ محتاج اظہار نہیں---- صورت حال یہ ہے کہ اب جنگ شروع ہو چکی ہے اور مسلمانوں اور عربوں کی مدتوں کی جمع کی ہوئی قوت خود آپس میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ اس صورت حال پر جس قدر رویا جائے اور ماتم کیا جائے، کم ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ کیا

ہوگا؟ اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات کہنی قبل از وقت ہوگی، تاہم جب یہ جنگ ختم ہوگی تو یہ کسی کی بھی فتح نہ ہوگی. بہر حال مسلمانوں کی شکست اور ان کی ہزیمت ہوگی۔ کاش، صدام حسین اپنی اس قوت کی حفاظت کرتے اور جمع کر کے رکھتے اور دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر اسرائیل کے خلاف محض سیاسی حربہ کے طور نہیں، بلکہ اخلاص کے ساتھ اس طاقت کا استعمال کرتے، تو اسلامی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے اسلام کے ایک سپاہی اور خدا کے لئے لڑنے والے مجاہد کی حیثیت سے محفوظ ہوجاتا، اس بات پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ عراق نے اپنی طاقت کا استعمال اول ایران کے لئے اور پھر کویت کے لئے کیا۔ جو قوت دشمنوں کے خلاف استعمال ہونی چاہیئے، دوستوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔

علماء کو بھی اور عوام کو بھی شکر گذار ہونا چاہیئے کہ گذشتہ سال سے ہندوستان میں نئے فقہی موضوعات پر غور و بحث اور اجتماعی تبادلہ ء خیال کی ایک نئی اور نہایت خوشگوار فضا پیدا ہوئی ہے اور اس مقصد کے لئے "اسلامک فقہ اکاڈمی" کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ اکاڈمی کے زیر انتظام تین نہایت کامیاب، با مقصد اور نتیجہ خیز سمینار منعقد ہوئے ہیں اور تمام ہی اہل علم و دانش نے اس کے طریق کار اور مقاصد کی تحسین کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اجتماعی اور خالص علمی اور تحقیقی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے اور ان کو گروہی سیاست سے بالاتر رکھنا چاہیئے۔

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ یہ محض تکرار ہے اور عرب دنیا کے ---------- مباحث کا اعادہ ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، عرب دنیا کے طریق فکر اور ہندوستان کے علماء و عوام کے طریق فکر میں جوہری اور بنیادی فرق ہے۔ علماء عرب کا مزاج فقہی احکام میں کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید کا عموماً نہیں ہے۔ وہ عام طور پر صرف نصوص کو پیش نظر رکھ کر فیصلے کرتے ہیں بر صغیر میں عام طور پر مسلمان مقلد ہیں۔ اسی لئے یہاں کے علماء بھی کتاب وسنت کے علاوہ فقہاء کی تصریحات کو خاص اہمیت دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء عرب کے فتاویٰ کو علماء ہند کی مراجعت اور تصدیق کے بغیر عام طور پر ہندوستان میں نہیں مانا جاتا، مثلاً اعضاء کی پیوند کاری ہی کا مسئلہ ہے۔ عرب دنیا میں اس موضوع پر متعدد مذاکرات ہوچکے تھے اور تجاویز بھی طے پاچکی تھیں جو جواز کی تھیں۔ مگر فقہ اکاڈمی کے اس موضوع پر سمینار سے پہلے تک ہندوستان کے شاید ہی کسی دار الافتاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔ سمینار کے موضوعات پر ہندوستان کے اہل علم کی جو تحریریں آئی ہیں، ان کی ان تحقیقات کو کسی بھی طرح ان موضوعات پر آنے والی دوسری تحریروں سے کم درجہ قرار نہیں دیا جاسکتا اس کے علاوہ عرب فضلاء کی تحریروں اور

خیالات سے ہمارے ہندوستانی علماء کو فائدہ اٹھانے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ زیر تذکرہ سمیناروں نے اس کے مواقع بھی عمومی سطح پر فراہم کردئے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان سمیناروں کی وجہ سے نوجوان فضلاء میں جدید فقہی موضوعات پر لکھنے اور غور کرنے کا جو ذوق ابھر رہا ہے، وہ نہایت خوش آیند بات ہے۔ اگر ان سمیناروں کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تو یہ بھی کافی ہوتا، ان اجتماعات نے اختلاف برداشت کرنے اور مخالف نقطۂ نظر کو سننے اور دلائل کی بنیاد پر قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ مختلف دبستان فقہ اور مکاتب فکر کے لوگوں کو امت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھنے کا حوصلہ دیا ہے مولانا شبلی نعمانی رح نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ علماء کچھ نہ کریں مگر ان کا ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھنا بھی بطور خود ایک بڑا کام ہے اور دیگر بہت سارے بڑے کام کے لئے پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

دعا کرنی چاہئے کہ علم و تحقیق اور فقہ کا یہ کاروان تیز گامی اور استقامت کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا رہے۔ اور ہر ملک اور ہر علاقہ اور ہر خطہ میں اہل علم "بحث و نظر"، "ذکر و فکر" اور مختلف علمی کاوشوں اور ارشادات و ہدایات کے ذریعہ اپنے وجود اور زندگی کا پتہ دیتے رہیں۔ بلاشبہ حرکت و عمل زندگی ہے اور جمود و غفلت موت۔

اکاڈمی۔ کے تحت آئندہ فقہی سمینار دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے زیر اہتمام ہونا طے پایا ہے۔ اس سمینار کا موضوع غیر سودی بینک کاری اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کی شرعی حیثیت ہے۔ دارالعلوم میں پورے زور و شور کے ساتھ اس کی تیاری جاری تھی مگر شہر کے موجودہ حالات نے کام میں بڑی رکاوٹ پیدا کردی ہے، امید ہے کہ حالات معتدل ہوتے ہی اس سلسلہ میں کام آگے بڑھے گا۔ اس سمینار کے لئے جو دو موضوعات مقرر کئے گئے ہیں، وہ دونوں معاشیات سے متعلق ہیں اور آج کی دنیا میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ بنک کاری ایک ضرورت ہے۔ عملاً اس نظام سے مکمل اجتناب ممکن نہیں۔ اب علماء وقت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کے مفاسد کا ازالہ کر کے اس کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالیں۔ انشورنس یوں تو قمار ہے۔ اس سے اختلاف مشکل ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت ہے، مسلمانوں کی جان و مال ان فسادات کا ہدف ہیں اور حکومت کو مسلمانوں کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیا ایک مجبوری اور ضرورت کے تحت انشورنس کی اجازت نہیں دی جا سکتی؟ اور کیا فقہاء کے قاعدہ مسلمہ "الضرورات تبیح المحظورات" کے دائرہ میں نہیں آتا ہے؟

ان پہلوؤں پر کتاب و سنت کے نصوص، فقہاء کے اجتہادات اور فقہی قواعد و کلیات کو

سامنے رکھ کر پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے، امید ہے کہ علماء اور دانشوران کا یہ اجتماع ان مسائل پر پوری بصیرت و فراست ایمانی اور زمانہ آگہی کے ساتھ غور کر کے کسی نتیجہ پر پہونچے گا۔ توقع ہے کہ فروری کی بجائے اب یہ سمینار انشاء اللہ مئی سنہ ۱۹۹۱ میں منعقد ہوگا۔ خدا کرے کہ حالات سازگار رہیں اور کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

سمینار کی مناسبت سے "فقہ اسلامی" کے موضوع پر "صفا" کا ایک خصوصی شمارہ طبع کیا جارہا ہے، جو ۱۲۔ اور ۱۳۔ نمبرات کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔ امید ہے کہ فقہ اسلامی کے اصولی پہلو پر یہ ایک مفید، معیاری اور تحقیقی مجموعہ مضامین ہوگا، یہ خصوصی شمارہ دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا، جس میں فقہ، اصول فقہ اور قواعد فقہ کی تاریخ، اہم فقہی شخصیات ائمہ اربعہ، داؤد ظاہری، ابن حزم اور ابن تیمیہ اور ان حضرات کے فقہی نقطۂ نظر کا ذکر ہوگا، شریعت کے مصادر کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، عرف و عادت سد ذرائع وغیرہ پر مختصر اور جامع بحث ہوگی، نیز علماء ہند کی فقہ و فتاویٰ کی خدمات پر بھی معلومات افزا تحریریں شامل ہوں گی۔

"صفا" کے پیش نظر شمارہ کو بھی ہم نے تنوع مضامین سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے ---- تفسیر قرآن کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ تفسیر کے ماخذ کیا ہیں اور تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟ اس موضوع پر ایک اہم اور مفید تحریر اس شمارہ میں شریک اشاعت ہے۔ حدیث میں بخاری شریف کی آخری حدیث پر مولانا زبیر احمد قاسمی، شیخ الحدیث جامعہ ہذا کی تقریر ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق ضرور اسے پسند کریں گے۔ حدیث میں تجارت کے احکام وقوانین پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ضرورت ہے کہ اس کو نمایاں کیا جائے تاکہ آج کے مسلمان اپنے بزرگوں کی طرح ان اصولوں پر عمل کر کے تجارت کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنائیں۔ اس غرض سے ایک مفید تحریر اس موضوع پر بھی قارئین پڑھ سکیں گے۔

جدید فقہی مسائل میں ایک "پوسٹ آپریشن" بھی ہے، اس پر بھی ایک مضمون شریک اشاعت ہے۔ جو بڑے عدل و توازن کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مستشرقین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیمات بعض علماء اہل کتاب سے استفادہ کا نتیجہ تھیں، اس پر بھی ایک مقالہ قارئین کے مطالعہ میں آئے گا، جس کا رنگ تحقیقی ہے اور متانت و سنجیدگی اس کے دوش بدوش ہے ------ قرآن مومن کی زندگی کی اساس اور اس کے فکر و عمل کے لئے روح کا درجہ رکھتا ہے۔ گذشتہ شمارہ میں راقم سطور نے علامہ اقبال کے قرآن مجید سے شغف کا ذکر کیا تھا، جس کی اہل علم نے تحسین کی، اس شمارہ میں قرآن مجید کے ایک اور عاشق، نواب بہادر یار جنگ اور قرآن مجید سے ان کے تعلق خاص کا ذکر ہے۔

اس بار شخصیات میں تاریخ اسلامی کی ایک قدآور شخصیت ابن شہاب زہری کا ذکر ہے۔ جن پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور جن کو مستشرقین نے اپنی ناروا تنقیدات کا خاص نشانہ بنایا ہے۔ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے بارے میں اسلام کے رویہ پر بھی ایک تحریر اس شمارہ میں پڑھی جاسکے گی، موجودہ حالات میں اس کی اہمیت واضح ہے۔ ان کے علاوہ سوال و جواب کے مستقل عنوان۔ کے تحت امریکہ سے آنے ہوئے ایک سوالنامہ کے جوابات بھی اس شمارہ میں شامل ہیں۔

اخیر میں قارئین سے درخواست ہے کہ وہ "صفا" کے خصوصی شمارہ کے سلسلہ میں ضرور اپنے مفید مشوروں سے سرفراز فرمائیں۔ سمینار کی کامیابی اور جامعہ ہذا کی ظاہری اور معنوی ترقیات کے لئے دعا کریں۔

محمد رضوان القاسمی
یکم رجب ۱۴۱۱ھ

****

مولانا محمد عابد ندوی
استاذ دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد

تفسیر قرآن کے ماخذ اور تفسیر بالرائے کی حقیقت

"قرآن مجید"۔۔۔ اللہ کا وہ آخری کلام اور پیغام ہے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت کے لئے خدا کے آخری پیغمبر حضور اکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم پر نازل ہوا، اس میں ان تمام عقائد و احکام کا ذکر ہے جن کے ماننے اور اختیار کرنے ہی پر دائمی سعادت اور کامیابی موقوف ہے، نیز یہ اتنے بے شمار علوم و معارف اور اسرار و حکم کا مخزن ہے جس کا استحصاء تقریباً ناممکن ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) سے قرآن کے بارے میں منقول ہے کہ۔۔۔ جو شخص اولین و آخرین کا علم چاہتا سو وہ قرآن میں خوب غور و فکر کرے (۱) اسی طرح قرآن کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "لا ینقضی عجائبہ"۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہونگے، (۲) تفسیر لفظ فسر سے مشتق ہے جس کے معنے لغت میں بھی کشف و بیان کے آتے ہیں اور اصطلاحاً بھی "تفسیر" قرآن میں مذکور عقائد و احکام اور علوم و معارف کے (۳) ظاہر کرنے اور کھول کھول کر بیان کرنے کا نام ہے، پھر قرآن چونکہ عربی زبان میں اور قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے اس زبان کے اصول و قواعد کی روشنی میں الفاظ قرآنی کی تشریح و توضیح، ترکیب کلام کی وجہ سے معنے میں حسن و جمال اور قوت و شدت کے پیدا ہونے کا ذکر اور اسی طرح کے دیگر ضروری امور جن کا تعلق الفاظ اور ترکیب کلام سے ہے، کا بیان بھی تفسیر قرآن کے دائرہ میں آتا ہے، یہی بیان و توضیح قرآن کریم کے نزول کا ایک مقصد بھی ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کو خطاب کرکے کہا گیا۔

"اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ اس کو لوگوں سے کھول کھول کر بیان کردیں جو ان کی طرف نازل کی گئی اور شاید وہ غور و فکر کریں۔" (۴)

ماخذ تفسیر

لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کے اس عظیم کلام کی تفسیر کا طریقہ کار کیا ہونا چاہئے اور وہ کیا مآخذ و مصادر ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کرکے قرآن کی تفسیر بیان کی جا سکتی ہے؟ تو اس سلسلہ میں تقریباً تمام ہی ارباب نظر نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ سب سے پہلے خود قرآن کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔ (۵) اس لئے کہ اسمیں بہت سی ایسی آیات ہیں جو اگر ایک جگہ مجمل ہیں تو دوسری جگہ

اسکی تفصیل مذکور ہے، کہیں ابہام ہے تو دوسری جگہ اس کی تشریح وتوضیح مل جاتی ہے، کبھی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کر دیتی ہے، اس لئے مفسرین کے نزدیک ایک مسلمہ اصول ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا،(٦)

تفسیر----- حدیث کی روشنی میں

اور اگر قرآن میں کسی آیت کی تفسیر نہ ملے تو پھر حدیث رسول کی طرف رجوع ہونا چاہیئے، اس لئے کہ وہ قرآن کی شرح کرتی ہے،(٧) خود قرآن نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منصب "تعلیم کتاب"(٨) قرار دیا ہے ظاہر ہے تعلیم کتاب میں الفاظ قرآنی کے ساتھ ساتھ معانی ومفاہیم قرآن بھی شامل ہے، امام شافعی نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ آپ (ص) کے ہر حکم و فیصلہ کا سرچشمہ خود قرآن مجید اور اس کا فہم ہے فرماتے ہیں، آپ (ص) نے جس بات کا کبھی حکم فرمایا اس کو قرآن ہی سے سمجھا۔(٩) عبداللہ بن مبارک سے مروی ہے کہ عمران بن حصین نے ایک شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا "کیا تم کتاب اللہ میں یہ بات پاتے ہو کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور اس میں قراءت جھرا نہیں، اسی طرح اور مثالیں دیں پھر کہا کیا تم کتاب اللہ میں ان تمام باتوں کو تفصیل کے ساتھ پاتے ہو؟ بے شک کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا اور سنت اس کی تفسیر کرتی ہے۔(١٠) فضیل بن زیاد سے احمد بن حنبل کا یہ قول منقول ہے۔ سنت کتاب اللہ کی تفسیر اور اس کی وضاحت کرتی ہے،(١١) نیز اسی بارے میں حضور (ص) کا یہ ارشاد بھی ہمیں ذخیرہ احادیث میں ملتا ہے کہ-- مجھے قرآن اور اسکے ساتھ ایک اور چیز (یعنی سنت) دی گئی ہے۔(١٢)

چنانچہ صحابہ کرام کا معمول بھی یہی تھا کہ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی یا کسی آیت کے معنی میں ان کو کوئی شبہ ہوتا تو حضورؐ کی طرف رجوع ہوتے اور آپ (ص) اس کی وضاحت فرمادیتے مثلاً جب آیت "اتخذوا احبارہم ورہبانہم اربابا من دون اللہ"۔ (خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے احبار و رہبان کو ارباب بنالیا)(١٣) نازل ہوئی تو حضرت عدی بن حاتم کو جو پہلے یہودی تھے شبہ ہوا، اور آپ (ص) کی طرف رجوع ہوئے، آپؐ نے آیت کی تفسیر فرمادی جس سے ان کا شبہ دور ہوگیا،(١٤) اسی طرح جب آیت الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولئک لہم الامن وہم مہتدون۔(١٥) (جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ "ظلم" کو نہیں شامل کیا، انہی کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں) نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر یہ آیت بڑی شاق گذری اور انہوں نے حضور (ص) سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا ہوگا جس نے ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا ہو، آپؐ نے وضاحت فرمائی کہ یہاں ظلم سے مراد عام ظلم نہیں جس کو وہ سمجھ رہے ہیں بلکہ یہاں "ظلم عظیم" یعنی شرک مراد ہے۔(١٦)

صحابہ کے تفسیری اقوال

یوں تو احادیث رسول بحیثیت مجموعی کتاب اللہ کے اجمال کی تفصیل اور اُس کے ابہام کی توضیح ہیں، چاہے اسمیں کسی قرآنی آیت کا حوالہ ہو یا نہ ہو، لیکن اصطلاحاً تفسیری روایات سے مراد وہ احادیث ہوتی ہیں جو آپ (ص) نے براہ راست کسی آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں ارشاد فرمائی ہوں، اس طرح کی تمام روایات کو امام بخاری (رح) اور دیگر محدثین نے اپنی کتابوں میں "کتاب التفسیر" کے مستقل عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے، لیکن ایسی روایتیں مقدار میں بہت ہی کم ہیں، اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ صحابہ کرام عربی زبان وادب اور اس کے اسالیب سے اچھی طرح واقف تھے نیز آیتوں کے اسباب نزول اور عہد جاہلیت کے مزاج و طبیعت سے بھی بخوبی آشنا تھے جس میں قرآن نازل ہوا، اس لئے وہ قرآن کے معنی و مفاہیم کو باسانی سمجھ سکتے تھے اور بہت ہی کم ان کو کسی شک وشبہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔۔۔ لیکن بعد کے دور میں جب کہ اسلام کا دائرہ پھیلتا اور بڑھتا گیا، مختلف قبائل اور خاندان کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے گئے جو عربی زبان وادب سے ناواقف یا کم از کم اس دور کے مزاج سے ناآشنا تھے جس میں قرآن کا نزول ہوا ہے تو شبہات اور عدم فہم کا معاملہ زیادہ مقدار و تعداد میں پیش آیا، اس وقت صحابہ کرام کی ذات ہی مرجع خلائق تھی، لوگ قرآن کو سمجھنے اور اپنے شبہات کو دور کرنے کے لئے ان ہی کی طرف رجوع ہوتے تھے اور عام طور پر مفسرین صحابہ اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ کسی آیت یا کسی لفظ کی تفسیر وتشریح میں حضور ؐ کے صریح اقوال تفسیری بیان فرماتے، یا آپ (ص) کے بہت سے دوسرے اقوال کی تائید سے آیت کی تفسیر متعین فرماتے

صحابہ کرام (رض) سے منقول تفسیری روایات بھی محفوظ و مدون ہیں، اس لئے کسی آیت کی تفسیر وتوضیح میں حضور (ص) کا کوئی صریح قول موجود نہ ہو تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جانا زیادہ بہتر اور مناسب ہے اس لئے کہ وہ قرآن کریم کو ہم سب سے زیادہ صحیح اور بہتر سمجھتے تھے اور اللہ تعالی نے انہیں فہم قرآن سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا، خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی وغیرہ کبار صحابہ کی اس سلسلہ میں کوئی نظیر نہیں، حضرت عبداللہ بن عباس کے متعلق تو خود حضور (ص) نے دعا فرمائی تھی کہ (اے اللہ ان کو دین کی سمجھ اور قرآن کا فہم عطا فرما۔ (۱۷) نیز مسروق تابعی سے ابن مسعود کا یہ قول بھی منقول ہے کہ ابن عباس قرآن کے کیا ہی بہتر ترجمان ہیں۔ (۱۸) ابن مسعود (رض) فرمایا کرتے تھے "اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو کہ کہاں نازل ہوئی اور کس کے بارے میں نازل ہوئی اور اگر میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوتا جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہو اور سواری پر اس کے پاس جایا جا سکتا ہو تو ضرور اس کے پاس جاتا۔ (۱۹) اسی طرح کا قول حضرت علی کا خود ان کے اپنے بارے میں بھی عامر بن واثلہ سے منقول ہے۔ (۲۰)

تفسیر بالروایہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے براہ راست جو تفسیری ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے اس کو اصطلاحاً تفسیر بالروایہ یا تفسیر بالمنقول کہا جاتا ہے، اس کے قابل قبول اور درست ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں بلکہ حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ ایسے صحابی کی تفسیر جس نے وحی اور نزول قرآن کا زمانہ دیکھا ہو حدیث مرفوع کے حکم میں ہوگی۔(۲۱) البتہ اس کی سند کے سلسلہ میں علماء کے درمیان بڑا اختلاف ہے، امام احمد بن حنبل کی طرف یہ مشہور جملہ بھی منسوب ہے کہ تین کتابوں کی کوئی اصل نہیں، ملاحم و فتن، مغازی اور تفسیر۔(۲۲) لیکن جب کوئی روایت صحیح سند سے ثابت ہو یا دوسری روایتوں سے اس کی تائید و توثیق ہو تو وہ تفسیر زیادہ مستند اور قابل قبول ہوگی۔ تفسیر ابن جریر طبری اس نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں حضور (ص) اور صحابہ کے منقول تقریباً تمام ہی تفسیری روایات کو جمع کر دیا گیا ہے، تفسیر ابن کثیر بھی تفسیر بالروایہ کی نمایاں تفاسیر میں سے ہے۔

تفسیر بالرای اور اس کی ضرورت

رائے کا اطلاق، اعتقاد اور اجتہاد و قیاس پر ہوتا ہے، تفسیر بالرائی اس تفسیر کو کہتے ہیں جس میں مفسر اپنے اجتہاد و قیاس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کرے، اس سے قطع نظر کہ حضور (ص) یا صحابہ کرام سے کسی آیت کی وہ تفسیر منقول ہے یا نہیں۔۔۔ چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ سے جو تفسیری روایات منقول ہیں وہ نظم و ترتیب کے ساتھ پورے قرآن کی تفسیر نہیں اس لئے کہ قرن اول میں علوم کی تدوین و ترتیب نہیں ہوئی تھی، عہد صحابہ و تابعین میں بھی یہی معمول تھا کہ جب کسی کو کوئی شبہ پیش آجاتا یا کسی آیت کا مفہوم کوئی سمجھنا چاہتا تو وہ تفسیر کا علم رکھنے والوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا شبہ دور کر لیتا اور اگر کہیں باقاعدہ درس و تدریس کا نظام بھی تھا جیسے حضرت عبداللہ بن عباس مکہ مکرمہ میں اور ابی بن کعب مدینہ منورہ میں درس دیا کرتے تھے تو وہاں بھی یہی صورت تھی کہ طلبہ سوال کرتے تھے اور وہ اس کے مطابق جواب دیتے، اسکی رعایت نہیں ہوتی تھی کہ گذشتہ کل جن آیات کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے آج ان آیات کے معاً بعد آنے والی آیات کی تفسیر و توضیح ہو، اس لئے تفسیر بالروایہ کا جو حصہ اور ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ پورے کلام پاک کی مرتب اور منظم تفسیر نہیں ہے، لیکن علم و فن کا طبعی تقاضہ ہے کہ اس میں جمود و تعطل نہ ہو بلکہ اس میں ترقی اور نمو کی صفت پائی جائے اور فن تفسیر بالروایہ پر انحصار کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا چنانچہ بہت جلد ابتدائی دور ہی میں اس نوع کی تفسیر کا آغاز ہو گیا جس میں مفسرین کی ذہانت اور جولانی فکر کا خاص حصہ تھا۔

تفسیر بالرای کا حکم

لیکن اس سلسلہ میں علماء شروع ہی سے مختلف الخیال رہے ہیں، بعض نے اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنے کو حرام قرار دیا اور بڑی شدت کے ساتھ اس سے روکا ہے، اور بعض نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھی ہے ---- نقطہ نظر کا یہ اختلاف بعض روایات و آثار پر مبنی ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کو ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) سے حضور صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے بھی قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس کو چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔(۲۲)

ابن جریر طبری کے علاوہ ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے اور امام ترمذی نے اس کو "حدیث حسن" کہا ہے۔(۲۳)

۲۔ حضرت جندب (رض) سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا "جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اگر صحیح کہا تو بھی غلطی کی۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی سھیل بن ابی حزم ہیں اور ان ہی کے طریق سے کئی اور حضرات نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے لیکن سھیل کے بارے میں بعض اہل علم نے کلام کیا ہے اسی لئے امام ترمذی (رح) نے اس روایت کو "غریب" کہا ہے۔(۲۴)

۳۔ بعض کبار صحابہ و تابعین کے بارے میں مروی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و توضیح سے احتراز کرتے تھے اور اپنی رائے اور قیاس سے تفسیر بیان نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو دقیق اور نازک بات سمجھ کر اس کی ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے نزدیک تفسیر کا مامون اور محفوظ طریقہ یہی تھا کہ منقول تفسیر پر ہی اکتفا کیا جائے، مثلاً حضرت ابو بکر صدیق (رض) کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو ارشاد فرمایا---

"جب قرآن کے کسی حرف کی تفسیر، میں اپنی رائے سے کروں تو کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہو گا اور کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی؟(۲۵)

اس طرح کے اقوال بعض دیگر صحابہ و تابعین کے بارے میں بھی مروی ہیں مثلاً یزید بن ابی یزید روایت کرتے ہیں کہ۔

"سعید بن المسیب (رح) ہم لوگوں میں زیادہ جاننے والے تھے، ہم ان سے حلال و حرام کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے، لیکن جب کسی آیت کی تفسیر ان سے پوچھتے تو ایسا خاموش ہو جاتے جیسا کہ کچھ سنا ہی نہ ہو۔"(۲۶)

ہشام بن عروہ اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ان کو کتاب اللہ کے کسی آیت کی تفسیر کرتے نہیں سنا۔(۲۷) عبید اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے فقہاء مدینہ کو ایسا پایا جو تفسیر کے سلسلہ میں کچھ کہنے کو امر عظیم سمجھتے تھے، ان ہی میں سالم بن

عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب اور نافع بھی ہیں۔ (۲۸) اصمعی باوجودیکہ لغت و نحو کے امام سمجھے جاتے ہیں لیکن جب ان سے کسی قرآنی لفظ کے معنی پوچھے جاتے تو کہتے کہ عرب کہتے ہیں کہ اس کے معنی فلاں فلاں ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کتاب وسنت میں کونسے معنے مراد ہیں؟ (۲۹) مسروق تابعی نے تو تفسیر قرآن سے روکتے ہوئے کہا کہ تفسیر گویا اللہ تعالی سے روایت کرنا اور اس کی مراد بیان کرنا ہے اس لئے اس سے بچا کرو۔ (۳۰)

اسی طرح کی بعض روایات وآثار پر اعتماد کرتے ہوئے بعض حضرات نے تفسیر بالرای کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیر بالرای کو مطلقاً ناجائز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں، نیز ان مذکورہ روایات میں سے کوئی روایت ایسی نہیں ہے جسکی بآسانی کوئی قابل قبول توجیہہ نہ کی جا سکتی ہو، اس کے بر خلاف جو دلائل تفسیر میں قیاس ورائے کے جواز پر دلالت کرنے والے ہیں وہ نہایت واضح اور دوٹوک ہیں ان میں کسی طرح کی تاویل کی گنجائش نہیں

۱۔۔سب سے پہلی بات تو یہ تسلیم شدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے قرآن کریم کی مکمل تفسیر نظم وترتیب کے ساتھ منقول نہیں ہے، اب اگر قرآن میں غور و فکر اور قیاس واجتہاد سے تفسیر متعین کرنے کا دروازہ بالکل بند کر دیا جائے تو عملاً قرآن کا ایک بڑا حصہ بے سود اور معطل ہو کر رہ جائے گا نہ تو اس سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنا ممکن ہوگا اور نہ ہی اس پر عمل کرنا، حالانکہ نزول قرآن کا ایک اہم مقصد یہی ہے، اسی لئے قرآن کریم کی بے شمار آیتوں میں قرآن کو سمجھنے، اس میں غور وفکر کرنے نیز اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس سے عبرت و موعظت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، مثلاً ارشاد باری ہے۔۔

> کیا وہ لوگ، قرآن میں غور وتدبر نہیں کرتے، اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف پاتے۔ (نساء۔۔۸۲)

> کیا وہ لوگ قرآن میں غور وتدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ (محمد۔۔۲۴)

> یہ بڑی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی تاکہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ (ص۔۔۲۹)

> ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم لوگ اس کو سمجھ سکو۔ (یوسف۔۔ ۲)

۲۔۔ دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ اگر تفسیر بالرای ناجائز ہو تو آخر اجتہاد کے کیا معنی؟ جو نہ

صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ شرائط کے پائے جانے کے بعد علم و اصول پر مبنی اجتہاد میں غلطی پر بھی ایک اجر اور اگر اجتہاد صحیح ہو تو دو گانہ اجر کی خوشخبری دی گئی ہے۔(۳۰) اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل (رض) سے ان کو یمن بھیجتے وقت یہ پوچھا تھا کہ اگر قرآن و حدیث میں بھی کسی مسئلہ کا حل نہ پاؤ تو کیا کرو گے ؟ تو حضرت معاذ (رض) نے یہی جواب دیا تھا کہ اجتہاد کرونگا اور اس میں کوئی کمی نہ کروں گا، حضور ﷺ نے ان کے جواب کو سراہا اور ان الفاظ میں اپنی خوشی ظاہر فرمائی " تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے خود اللہ اور اس کا رسول راضی ہے۔(۳۲)

اسی طرح خود قرآن مجید میں جہاں عام ناواقف لوگوں کو اہل علم سے مسائل دریافت کرنے کا حکم دیا گیا وہیں اہل علم کو بھی اشارۃً بھی اس بات کا مکلف بنایا کہ وہ قرآن و سنت میں غور و تدبر اور استنباط مسائل کا فریضہ انجام دیتے رہیں تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کی صحیح رہنمائی ہوتی رہے، ارشاد ہے۔۔

> اور جب ان کو امن یا خطرہ کی کوئی بات پہونچتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں، اگر وہ رسول اور اولوالامر تک پہنچاتے تو ان میں جو بات کی تہہ تک پہونچنے والے ہیں وہ اس کو جان لیتے۔(نساء۔۔۸۳)
>
> سارے کے سارے مسلمان تو جہاد میں نہ نکلے سو ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت اللہ کے راستہ میں نکلے اور کچھ لوگ رہ جائیں تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور ان لوگوں کے واپس آنے کے بعد انہیں خدا سے ڈرائیں تاکہ وہ بھی برے کاموں سے بچ سکیں۔(توبہ۔۔۱۲۲)

اب اگر تفسیر بالرای کو مطلقاً ناجائز قرار دیا جائے تو استنباط مسائل اور " تفقہ فی الدین " کے آخر کیا معنے رہ جاتے ہیں ؟ بلکہ اس صورت میں کتاب اللہ کے ایک حکم سے عدول لازم آئے گا، چنانچہ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی ابوالحسن ماوردی نے لکھا ہے۔۔

> " بعض نام نہاد اصحاب ورع نے اس حدیث کو (۳۳) اپنے ظاہر پر محمول کیا ہے اور اس بات سے روکا ہے کہ آدمی اپنے اجتہاد سے معانی قرآن کا استنباط کرے، چاہے اس پر شواہد موجود ہوں اور کوئی نص صریح اس کے معارض نہ ہو، حالانکہ یہ تو قرآن میں غور و فکر اور استنباط احکام کے حکم سے عدول ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔۔ لعلمہ الذین یستنبطونہ الخ ۔۔ اور اگر وہ بات جو انہوں نے بیان کی صحیح ہو تو کوئی چیز بھی استنباط سے معلوم نہ ہو سکے گی اور اکثر لوگ کتاب اللہ سے کچھ بھی نہ سمجھ سکیں گے۔(۳۴)

۳۔۔۔ اسی طرح ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کو یہ دعا کی کہ " اللہ اس کو دین کی سمجھ اور قرآن کا علم عطا فرما۔۔ اگر تفسیر قرآن کا انحصار

نقل و سماع پر ہی ہو تو خصوصیت سے حضرت ابن عباس (رض) کے حق میں اس دعا کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔

۴--- بہت سی روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اکثر صحابہ و تابعین نے تفسیر قرآن سے شغف رکھا نیز بہت سے معنی و مطالب میں باہم اختلاف بھی کیا اور ظاہر ہے یہ تمام معانی انہوں نے حضور (ص) سے نہ سنے تھے بلکہ ان میں سے بعض معانی و مطالب ان کے اپنے اجتہادی بھی تھے ورنہ ان کے درمیان باہم اختلاف نہ ہوتا۔-- اگر تفسیر بالرای ناجائز ہو تو صحابہ کبھی اپنی رائے اور فہم سے تفسیر بیان نہ کرتے۔

یہ وہ دلائل ہیں جو تفسیر بالرای کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہیں، اسی بناء پر اکثر علماء سلف و خلف کا یہی نقطہء نظر ہے کہ قرآن کی تفسیر اپنی رائے اور اجتہاد سے کی جا سکتی ہے بلکہ بعض حضرات نے تو اس سلسلہ میں ایک گونہ بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور تفسیر بالرای کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ ہر شخص کے لئے تفسیر قرآن میں قیاس آرائیاں کرنے کی چھوٹ مل گئی ہے، حالانکہ اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔

چنانچہ امام راغب اصفہانی باوجود معتزلی ہونے کے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فریقین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں---

> "یہ دونوں مذہب دراصل افراط و تفریط پر مبنی ہیں، جس نے تفسیر منقول پر انحصار کیا اس نے تفسیر کے نہایت ضروری حصہ کو نظر انداز کر دیا، اور جس نے ہر کس و ناکس کو تفسیر قرآن کی اجازت دی اس نے کتاب عزیز کو اختلاط و امتزاج کا نشانہ بنا دیا، گویا اس نے قرآن کریم کی آیت "لیدبروا آیاتہ" کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھا۔ (۳۵)

تفسیر بالرای کی قسمیں

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر بالرای کا دائرہ محدود اور اس کی حد بندی نہایت ضروری ہے، چنانچہ متقدمین علماء نے اس کی دو قسمیں کر کے اس کی تحدید کر دی ہے ایک تفسیر بالرای وہ ہے جو محمود اور مطلوب ہے دوسرے وہ تفسیر ہے جو مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ تفسیر بالرای محمود تو یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر اور اس کے معنی زبان و لغت اور اس کے اصول و قواعد کی رعایت کرتے ہوئے ایسے بیان کئے جائیں جو روح شریعت کے بھی خلاف نہ ہوں، یعنی شریعت کے بنیادی عقائد و اصول پر کوئی زد نہ پڑتی ہو، اسی لئے محققین علماء نے تفسیر بالرای کے جواز کے لئے مختلف شرطیں رکھدی ہیں، مثلاً وہ عربی زبان کے مختلف فنون (صرف و نحو، معانی و بیان وغیرہ) سے واقفیت گویا عربی زبان و ادب میں مہارت رکھتا ہو اور اسالیب کلام کو بھی اچھی

طرح جانتا ہو نیز اس کے ساتھ ساتھ، اسلوب قرآن اور مضامین قرآن وغیرہ سے بھی بے بہرہ نہ ہو، اگر کسی میں یہ شرائط نہ پائی جائیں تو اس کو اس بات کا حق نہیں کہ اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنے کی کوشش کرے، نیز تفسیر بالرای وہی قابل قبول ہوگی جو عربی زبان کے اصول و ضوابط کی رعایت کرتے ہوئے کی جائے اور وہ روح شریعت کے بھی مطابق ہو، اگر کوئی تفسیر آزاد، بے لگام، اصول عربیت اور روح شریعت کو نظر انداز کرکے کی جائے اور وہ متفق علیہ عقائد واحکام دینیہ کے خلاف ہو جیسے فرق ضالہ، (باطنیہ اور شیعہ وغیرہ) کی تفسیر ہوا کرتی ہے تو وہ تفسیر بالرای مذموم ہوگی اور ہرگز قابل قبول نہ ہوگی، مثلاً شیعہ حضرات آیات قرآنی "مرج البحرین یلتقیان" میں "بحرین" سے حضرت علی و فاطمہ اور "یخرج منہما اللؤلؤ والمرجان" میں "لؤلؤ و مرجان" سے حضرات حسنین مراد لیتے ہیں (۳۶) جو زبان ولغت کے قواعد کے ساتھ شریعت کی روح کے بھی سراسر خلاف ہے۔

اسی طرح تفسیر بالرای کا یہ بھی ایک مذموم ترین پہلو ہے کہ اس میں خواہشات نفسانی کی پیروی کی جائے اور قرآن کو عقائد وآراء کا تابع بنا دیا جائے، یعنی پہلے سے طے شدہ رائے یا عقیدہ کے مطابق آیات قرآنی کی تفسیر کی جائے چاہے اس میں کتنی ہی کھینچ تان اور توڑ مروڑ کرنی پڑے۔

احادیث وآثار کی توجیہ

ایسے ہی لوگوں کے لئے وہ وعید ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے جس کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا، جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے اس کو چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ چنانچہ امام غزالی (رح) نے بھی اس سلسلہ میں یہ صراحت کی ہے کہ ---

> تفسیر بالرای دو موقعوں پر جائز نہیں ہے، ایک تو یہ کہ خواہش نفس کی بنیاد پر تفسیر کی جائے، بایں طور کہ آیت کے موضوع کے سلسلہ میں مفسر کی کوئی خاص رائے اور نظریہ ہو جس کی طرف اس کا طبعی رجحان ہو، پھر وہ "نص قرآنی" کی اپنی رائے اور خواہش کے مطابق توجیہہ کرے تاکہ اس کے ذریعہ اپنا مدعا ثابت ہو سکے اور مقصود کو پا سکے۔ (۳۷)

پھر امام غزالی (رح) نے اس کی چند مثالیں ذکر کرنے کے بعد دوسری صورت کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں منقول روایات وآثار کا تتبع کئے بغیر نیز ان وسائل اور صلاحیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی جن کا ایک مفسر کے اندر پایا جانا "نص قرآنی" کے مدلول کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہیں، جیسے الفاظ کی دلالت اور استنباط مسائل کے طریقے، قرآن کے اسالیب بیان سے واقفیت وغیرہ، ان سب کے نہ ہوتے ہوئے صرف قرآن کے ظاہری الفاظ کو سامنے رکھکر تفسیر بیان کی جائے، اس کے بعد اخیر میں لکھتے ہیں کہ

"جو شخص صرف عربی دانی کی بنیاد پر استنباط معانی کی کوشش کرے گا تو اس سے غلطیاں زیادہ صادر ہوں گی اور وہ اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو جائیگا (۳۸)

علامہ ابن قیم جوزی (رح) رقمطراز ہیں۔۔۔

"جب کسی سے کتاب اللہ کی کوئی آیت یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ پوچھا جائے تو اسے یہ حق نہیں کہ اپنی خواہش اور اپنے مخصوص نظریہ کے مطابق فاسد تاویلات کرکے اس آیت یا سنت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹادے اور جو شخص ایسا کرے تو وہ اس بات کا سزاوار ہے کہ اسے فتویٰ دینے سے روک دیا جائے اور اس پر بندش عائد کردی جائے، یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ قدیم وجدید ائمہ اسلام نے اس امر کی تصریح کی ہے۔ (۳۹)

رہی دوسری حدیث جس میں آپؐ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ "جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور اس نے صحیح بھی کہا تو غلطی کی۔ تو اس سلسلہ میں ایک بات اس سے قبل ذکر کی جاچکی ہے کہ اسکی صحت مشتبہ ہے، امام ترمذی (رح) نے اس کو غریب کہا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی سہیل کو حاتم اور یحیی بن معین نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (۴۰)

دوسرے حقیقت یہ ہیکہ اس میں رائے سے مراد وہی ہے جو مذموم کے دائرہ میں آتی ہے یعنی صلاحیت واہلیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی بلا دلیل و برہان صرف وظن و تخمین کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر بیان کردی جائے، یہ تفسیر اگر حقیقت کے لحاظ سے صحیح بھی ہو تو اس کے طریقۂ کار کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر ظن و تخمین سے کوئی بات کہنے اور ایسی بات کہنے سے جس کا آدمی کو علم نہ ہو روکا گیا ہے۔ (۴۱)

اسی طرح بعض ائمہ سلف کے بارے میں جو منقول ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کرنے سے احتراز کرتے تھے تو ان کے بارے میں بھی یہی بات کہی جائے گی کہ وہ یا تو تقویٰ واحتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر اس سے گریز کرتے تھے کہ مبادا ان سے حق بات بیان نہ ہو سکے جس کے وہ مکلف ہیں یا پھر یہ کہ وہ صرف ان ہی مقامات میں کچھ کہنے سے رکتے تھے جہاں ان کے ذہن میں کوئی دلیل و برہان نہ ہو۔۔۔ اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے حضرت ابوبکر صدیق (رض) جن کے بارے میں ایک روایت اس سے قبل نقل کی گئی کہ جب ان سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو ارشاد فرمایا کہ "اگر میں قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو کونسا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا اور کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی۔۔۔ انہی کے بارے میں ایک روایت یہ بھی

ہے کہ جب ان سے آیت کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ "کلالہ" سے مراد کون ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

میں اس سلسلہ میں اپنی رائے سے کہہ رہا ہوں، اگر صحیح ہو تو سمجھا جائے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہو تو میرے اور شیطان کی طرف سے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا انتقال ہو جائے اور اس کے اصول و فروع موجود نہ ہوں۔ (۴۲)

حضرت ابوبکر (رضؓ) کے دو ارشادات سے جو بظاہر متضاد ہیں معلوم ہوا کہ آپ کو ایسی رائے دینے سے خوف تھا جو مذموم ہو اور جس کی بنیاد ظن و تخمین پر ہو نہ کہ وہ رائے جو علم و تحقیق پر مبنی ہو اور جسکی کوئی دلیل موجود ہو، ایسی رائے ممدوح ہے، مذموم نہیں۔
علامہ ابن تیمیہ (رحؒ) نے بھی صراحت کیا ہے کہ

"ائمہ سلف سے اس ضمن میں جو اقوال بھی منقول ہیں وہ اسی قسم کی تفسیر سے متعلق ہیں جو بلا علم و برہان ہو، جہاں تک لغت و شرع پر مبنی تفسیر کا تعلق ہے اسمیں کچھ مضائقہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء سے بکثرت تفسیری اقوال منقول ہیں اور ان کے یہ اقوال علم و تحقیق پر مبنی ہیں، جو بات انہیں معلوم نہ ہوتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے، یہی بات اہل علم پر واجب بھی ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اس کے بارے میں سکوت سے کام لیا جائے اور جو معلوم ہو اس کا بر ملا اظہار کیا جائے اور اسے چھپایا نہ جائے۔ (۴۳)

تفسیر بالرای مذموم کی ابتداء

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائیگی، وہ سب دوزخی ہونگے سوائے اس فرقہ کے جو میرے اور میرے اصحاب کے راستہ پر گامزن ہو (۴۴) -----
یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یقیناً آپ (ص) کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور اس طور پر کہ بہت جلد یہ امت اختلاف وانتشار کا شکار ہوتی گئی اور اس کا شیرازہ بکھرتا گیا جس کے نتیجہ میں بے شمار فرقے اور مذاہب پیدا ہو گئے، چونکہ قرآن انکے درمیان حائل تھا اسلئے ہر ایک نے قرآن ہی کو اپنا ہدف و نشانہ بنایا اور ایسے لوگ بھی معرض وجود میں آئے جو اپنے مذہب و مسلک کی حمایت اور اپنے عقائد کا دفاع کرنے میں آیات قرآنی کی ایسی دور از کار تاویلات سے بھی گریز نہیں کرتے جسکی وہ آیات بالکل ہی متحمل نہ ہوں، جو آیات ان کے مسلک کے صریح کے خلاف ہوتیں ان کی بھی ایسی تاویل کرتے جو تحریف قرآن کا مصداق ہوتی۔ یہیں سے اس تفسیر بالرای کا آغاز ہوا جس کی علماء نے کبھی اجازت نہیں دی۔

گمراہ فرقوں کے چند تفسیری نمونے

جن گمراہ فرقوں نے اپنے باطل خیالات و عقائد کو رواج دینے اور انہیں دوام و استحکام بخشنے کے لئے اس قسم کی تفسیر بالرای کی صورت قرآن کو اپنا تختہ ء مشق بنایا ان میں سرفہرست معتزلہ، قدریہ، مرجیہ، جہمیہ اور خوارج و روافض ہیں۔ ان کے ماننے والوں میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے قرآن سے محض اس لئے شغف رکھا تاکہ وہ اس میں غوطہ زن ہو کر کسی طرح اپنے مسلک کو ثابت کر سکیں اور قرآن کو اپنے افکار و عقائد کے سانچہ میں ڈھال سکیں، بلکہ خاص اسی نقطہ ء نظر سے متعدد کتب تفسیر وجود میں آئیں جو تفسیر کے نام پر خرافات کا مجموعہ ہی کہی جا سکتی ہیں اور اب بھی ان کے یہ زیغ و ضلال اور " شاہکار " صفحات قرطاس پر محفوظ ہیں --- جہاں تک ان گمراہ فرقوں کے عقائد و آراء کی تفصیل و وضاحت، ان کو رواج دینے اور قرآن کے ذریعہ ان کو ثابت کرنے کی کوششوں کا تعلق ہے تو یہ خود ایک مستقل موضوع ہے یہاں صرف بطور نمونہ چند مثالیں سپرد قلم کرنا مقصود ہے۔

معتزلہ کی تفسیر

مثلاً دیکھئے! معتزلہ جو روءیت باری کے منکر ہیں ان آیات کی جو ان کے اس عقیدہ کے خلاف ہے کس طرح تفسیر کرتے ہیں؟ سورہ قیامہ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے " کچھ چہرے اس دن بارونق ہونگے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہونگے (۴۵) --- معتزلہ کہتے ہیں کہ یہاں دیکھنے سے مراد مادی روءیت نہیں بلکہ رحمت خداوندی کی امید اور توقع ہے، کیونکہ یہ لفظ عربی میں اس مفہوم پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالی کا ارشاد ہے " اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا "۔ (۴۶) اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ " تکلیم "۔ کے معنی لغت میں صرف بات کرنے ہی کے نہیں بلکہ زخمی کرنے کے بھی آتے ہیں اس لئے یہاں مراد ربانی یہ ہے کہ موسیٰ (ع) کو مصائب و آلام میں مبتلا کر کے زخمی کیا گیا --- غرض وہ کہیں لغت کا سہارا لیکر اور کہیں مجاز و استعارات اور کنایات کا سہارا لیکر قرآنی آیات کو اپنے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسا اس لئے ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات وہ ہیں کہ ان کے حقیقی معنی معتزلہ کے صریح خلاف جاتے ہیں، وہاں معتزلہ ان آیات میں مجازات و کنایات اور استعارات کا سہارا لیتے ہیں اس لئے یہ کہنے میں بھی مضائقہ نہیں کہ علوم عربیہ، بالخصوص معانی و بیان معتزلہ کی ایک دینی ضرورت بن گئی تھیں، اسی لئے انہوں نے ان علوم سے خاص اعتناء کیا ہے ---

معتزلہ کی تفسیر کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ---

" معتزلہ پہلے ایک عقیدہ جما لیتے ہیں اور پھر قرآنی الفاظ کو اس کے تابع کرتے ہیں، صحابہ و تابعین، ائمہ مسلمین اور علماء سلف میں سے کوئی بھی ان کے نظریات اور تفسیر کی تائید و حمایت نہیں کرتا، ان کی تفسیر کا بطلان مختلف وجوہ

سے ظاہر ہوتا ہے، ان میں سے بعض لوگ بڑے شیریں مقال اور فصیح ہوتے ہیں مگر اپنی عبارت میں بدعت کو اس طرح چھپادیتے ہیں کہ لوگوں کو پتہ تک نہیں چلتا۔(۴۷)

شیعہ کی تفسیر

یہ گمراہ اسلامی فرقوں میں سب سے قدیم اسلامی فرقہ ہے بلکہ یہ ایک فرقہ کی بجائے بہت جلد مختلف فرقوں میں بٹ گیا، ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ تمام بدعتی فرقوں میں شیعہ زیادہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔(۴۸) پھر ہر فرقہ مختلف افکار و نظریات کا حامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا مدعی بھی ہے، چنانچہ ہر ایک فرقہ نے قرآن کو تختہ ء مشق بنایا اور اس کو اپنے عقائد و افکار کے سانچہ میں ڈھالنے کی امکانی حد تک کوشش کی، لیکن چونکہ خود اللہ تعالی نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اس لئے ان کی یہ کوششیں رائیگاں گئیں، شیعیت کے بے شمار فرقے نیست و نابود ہوگئے اور جو پائے جاتے ہیں ان کے عقائد کا بطلان اور تفسیری اباطیل بھی اہل علم پر مخفی نہیں، شیعہ کی تفسیر کے بارے میں امام ابن قتیبہ کا یہ جامع تبصرہ بھی نقل کر دینا مناسب ہوگا کہ۔۔۔

"شیعہ کی تفسیر قرآن معتزلہ کی تفسیر سے بھی زیادہ انوکھی اور نرالی ہے، شیعہ کا دعویٰ ہے کہ امام نے "الجفر" نامی کتاب میں چمڑے پر ہر وہ بات لکھ دی تھی جس کی ضرورت ہے اور جو واقعات تا قیامت پیش آنے والے ہیں، اس میں مرقوم ہے کہ آیت " ورث سلیمان داود" (النمل ۔۔۔ ۱۶) کے معنی یہ ہیں کہ نبی کریم ؐ حضرت علی کے علم کے وارث ہوئے، اسی طرح آیت "ان تذبحوا بقرہ" (البقرہ ۔۔۔ ۶۷) میں بقرہ (گائے) سے حضرت عائشہ مراد ہیں، سورہ بقرہ کی آیت ۷۳ "اضربوہ ببعضہا" میں طلحہ و زبیر مقصود ہیں، شیعہ کا قول ہے کہ قرآن کریم میں خمر و میسر (شراب اور جوا) سے ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) مراد ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قرآنی الفاظ " الجبت و الطاغوت" (بت اور شیطان) سے معاویہ اور عمرو بن العاص کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب تفسیری نکات بیان کئے گئے ہیں"۔(۴۹)

تفسیر باطنی

شیعہ کا ایک فرقہ اسماعیلیہ ہے جو باطنیہ کے نام سے بھی موسوم ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسے امام کو مانتے ہیں جو ان کے پیشوا اور رہنما ہیں لیکن مستور ہوگئے ہیں، قیامت سے پہلے کبھی

بھی ظاہر ہو سکتے ہیں، جب ان کا ظہور ہوگا تو دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ ان کا عقید ہے کہ شریعت کے دو حصے ہیں، ایک ظاہر اور ایک باطن، لوگوں کو صرف ظاہر کا علم ہوتا ہے باطن کے علم سے صرف امام مطلع ہوتا ہے، پھر اس عقیدہ کے تحت وہ آیات قرآنی کی ایسی توجیہ و تاویل کرتے ہیں جس کو معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی قبول کرنے سے انکار کرے۔

بطور مثال چند "جواہر پارے"۔ ملاحظہ فرمایئے ---

۱---وضو سے مراد امام کی پیروی ہے۔

۲---تیمم کا مطلب یہ ہے کہ جب اصلی امام موجود نہ ہو تو اس کے جانشین سے استفادہ کیا جائے۔

۳---زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ باطنی عقائد و احکام کا علم حاصل کر کے اپنے نفس کو پاک کیا جائے۔

۴---ملائکہ سے باطنیہ کے وہ داعی مراد ہیں جو ان کے عقائد کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور شیاطین سے باطنیہ کے مخالفین مراد ہیں---(۵۰)

اس سے زیادہ حیرت تو اس پر ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کا ظاہری مفہوم مراد ہی نہیں، گویا ان کا اصل مقصد شریعت کی عمارت کو منہدم کر کے اس کی جگہ نیا دین و مذہب قائم کرنا ہے۔

صوفیاء کی تفسیر

اب اخیر میں صوفیاء کی تفسیر جس کو اصطلاحاً "تفسیر اشاری"۔ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، پر مختصر گفتگو بے محل نہ ہوگی، بلکہ اس کے بغیر شاید یہ بحث نامکمل اور تشنہ محسوس کی جائے گی،

"تفسیر اشاری"۔ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیات قرآنی کی تفسیر ان مخفی اشارات کی بنیاد پر کی جائے جو ارباب سلوک و تصوف پر منکشف ہوتے ہیں اور جس کا فہم و ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے۔ کیا صوفیاء کی یہ تفسیر قابل قبول ہوگی؟---اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم ان روایات کو ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو صوفیاء کی "تفسیر اشاری"۔ کا مدار اور بنیاد ہے اور وہ یہ ہے۔ فریابی نے حضرت حسن سے مرسلاً حضور صلی اللہ علیہ و سلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا، "ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ایک حد ہے اور ایک بلندی"۔ (۵۱) اسی طرح کی ایک روایت دیلمی نے بھی حضرت عبد الرحمان بن عوف (رض) سے مرفوعاً روایت کی ہے، نیز یہی قول حضرت ابن عباس (رضہ) کا بھی ہے وہ فرماتے ہیں "قرآنی علوم چند انواع و اقسام پر مشتمل ہے، اس کے کئی ظاہر ہیں اور کئی باطن۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔

(۵۲) اسی طرح حضرت ابن مسعود کا ایک قول بالکل شروع ہی میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ "جو شخص اولین و آخرین کا علم چاہے وہ قرآن میں غور و تدبر کرے"۔ ظاہر ہے قرآن کی ظاہری تفسیر سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس بات کے ماننے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا کہ قرآن کے معانی اور مقصود ربانی کی انتہا اور آخری حد وہ نہیں جو اس کے ظاہر سے سمجھ میں آجائے، یہی حقیقت قرآن مجید کی مختلف آیات پر غور کرنے سے بھی منکشف ہوتی ہے، مثلاً قرآن کی بے شمار آیات میں خود قرآن کے اندر غور و تدبر کی دعوت دی گئی ہے، ایک موقع پر کافروں سے خطاب کرکے کہا گیا کہ، اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ بات ہی نہیں سمجھتی۔ (۵۳) ظاہر ہے جن کا کفار پر یہ ملامت کی گئی ہے وہ اہل عرب ہی تھے جو بے تکلف عربی زبان اچھی طرح بول اور سمجھ سکتے تھے، لہذا یہ کہنا کہ وہ قرآن کے ظاہری معنی و مفہوم کو نہیں سمجھتے تھے کسی طرح صحیح نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مقصود و مراد ربانی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن میں غور و تدبر کی دعوت دراصل اس کے باطنی معانی اور حقائق تک پہونچنے ہی کی کوشش ہے ورنہ ایک عام عربی دان بھی ظاہری مفہوم کو بغیر غور و فکر کے باسانی سمجھ سکتا ہے، چہ جائیکہ اہل عرب جن کی مادری زبان ہی عربی تھی ---- اسی طرح صحابہ کرام سے منقول بعض تفسیری روایات کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے مثلاً مقاتل کی روایت ہے کہ جب سورہ نصر نازل ہوئی اور آپ (ص) نے صحابہ کرام کے ایک مجمع میں جن میں حضرت ابوبکر و عمر وغیرہ بھی تھے، تلاوت فرمائی تو عام صحابہ کرام اس سے بہت خوش ہوئے کہ اس میں مکہ فتح ہونے اور دین کے غلبہ پانے کی خوشخبری دی گئی ہے لیکن حضرت ابن عباس (رض) رونے لگے دریافت کرنے پر بتلایا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے آپ (ص) نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (۵۴) اسی مفہوم کی ایک روایت امام بخاری نے بھی کتاب التفسیر میں نقل کی ہے۔ اسی طرح جب سورہ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی کہ "آج میں نے تمہارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا (۵۵) تو حضرت عمر (رض) رونے لگے اور فرمایا کہ جب دین کامل ہوچکا تو اب حضور ﷺ دنیا میں موجود نہیں رہیں گے، آپ کی وفات کا وقت قریب آچکا ہے اور دین کی تکمیل کے بعد گویا اب اس کے تنزل و انحطاط کا آغاز ہوگا۔ اس موقع پر بھی حضور نے حضرت عمر کی تصدیق فرمائی (۵۶) دیگر صحابہ نے اس کا ظاہری مفہوم مراد لیا تھا اس لئے وہ خاموش رہے لیکن حضرت عمر اور حضرت ابن عباس نے وہ مفہوم مراد لیا جو بطریق اشارہ ثابت ہوا اور خود آپ (ص) نے اس کی تصدیق فرمائی۔

یہ وہ روایات ہیں جن سے "تفسیر اشاری" کا جواز ثابت ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ان روایات میں حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے جو تفسیر منقول ہے وہ ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف بھی نہیں ہے اور نہ ایسی ہے کہ جس کو عقل انسانی قبول نہ کر

سکے اس کے برخلاف صوفیاء سے منقول تفسیر اشاری کے سلسلہ میں ہمیں بہت سے ایسے اقوال بھی ملتے ہیں جن کے سامنے عقل انسانی عاجزرہ جاتی ہے اور کوئی قابل قبول توجیہ اس کی نہیں کی جاسکتی، مثلاً آل عمران کی آیت ۹۶ "ان اول بیت وضع للناس" کی تفسیر میں سہل تستری لکھتے ہیں کہ، اولین گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے یہ اس کا ظاہری مفہوم ہے لیکن باطنی معنے کے لحاظ سے اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ و سلم ہیں جن پر ایک موحد شخص ہی ایمان لا سکتا ہے (۵۷)۔

سہل ہی نے بسم اللہ الرحمان الرحیم کی تفسیر میں لکھا ہے۔۔

بسم اللہ کی باء سے بہاء اللہ، سین سے سناء اللہ اور میم سے مجد اللہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور لفظ اللہ اسم اعظم ہے جو سب اسماء کو شامل ہے، اس کے الف و لام کے درمیان ایک حرف پوشیدہ ہے جس کے راز سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو میل کچیل سے پاک ہو اور حلال روزی پر قناعت کرنے والا ہو، رحمان ایک اسم ہے جس میں الف ولام کے مابین پوشیدہ حرف کی خصوصیت پائی جاتی ہے رحیم کے معنے ہیں اپنے بندوں کو رزق دے کر ان پر رحم کرنے والا، ان کو پیدا کرنے والا اور اپنے قدیم علم کے مطابق ان کو شفقت کی نگاہ سے دیکھنے والا (۵۸)

ابو محمد شیرازی اپنی تفسیر "عرائس البیان فی حقائق القرآن" میں سورہ توبہ کی آیت نمبر ۹۰۔۔۔(۵۹) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔

"خداوند کریم نے اس آیت کریمہ میں اہل مراقبہ کا ذکر کیا ہے جو مشاہدہ اور بحر ازلیات میں ڈوبے رہتے ہیں اور جو مجاہدہ وریاضت میں اس حد تک حصہ لیتے ہیں کہ ان کے جسم کمزور اور بیمار ہوجاتے ہیں، ذکر و فکر میں محو رہنے سے ان کے قلوب پگھل جاتے ہیں، وہ اپنے پاکیزہ عقائد کی بناء پر دنیائے فانی سے نکل کر باقیات کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان لوگوں کو امتحان کی مشقت میں نہیں ڈالا جاتا، اسی لئے فرمایا کہ کمزوروں پر کچھ حرج نہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ جن کو محبت کے بوجھ نے کمزور کر دیا ہو اور رقت شوق نے مریض بنا دیا ہو ان پر کچھ عتاب نہ ہوگا اس لئے کہ وہ مقتول محبت ہیں وہ وفور شوق کے باعث کمزور ہیں اور ان کی بیماری حب و عشق کے سواء کچھ نہیں"۔ (۶۰)

تفسیر اشاری کا حکم

آیات قرآنی کی تفسیر کے سلسلہ میں صوفیاء سے منقول اس طرح کی دوراز کار تاویلات کی

کمی نہیں بلکہ بعض کتب تفسیر تو اسی کا مجموعہ ہیں، چنانچہ اس طرح کی تفسیر بیان کرنے کے سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے اس کو ناجائز قرار دیا اور بعض نے صوفیاء کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے نرم رویہ اختیار کیا ہے۔ شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی سے پوچھا گیا کہ ایک صاحب "من ذاالذی یشفع عندہ۔ (۶۱) کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ "ذل۔ ذل (ذلت) سے مشتق ہے، "ذی" اسم اشارہ ہے جس کا مشار الیہ نفس ہے، یشف، شفا (شفا پانا) سے ماخوذ ہے اور "ع" وعی سے امر کا صیغہ ہے ("جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جس نے نفس کو ذلیل کیا وہ شفا پائے گا، اس نکتہ کو یاد رکھو۔) امام بلقینی (رح) نے فتویٰ دیا کہ ایسا شخص ملحد ہے، (۶۲) ابن صلاح نے اپنے فتاوی میں امام واحدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو عبدالرحمان السلمی نے "حقائق التفسیر" کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے "اگر کوئی عقیدہ رکھا کہ یہ قرآن کی تفسیر ہے تو اس نے کفر کیا"۔۔۔ ابن صلاح یہ قول ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب کوئی قابل اعتماد شخص ایسی بات کہتا ہے تو میں حسن ظن کی بنا پر کہتا ہوں کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان نہیں کرتا اگر ایسا ہو تو پھر ان میں اور باطنیہ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، دراصل یہ لوگ معانی قرآن کی تائید و حمایت میں ضمناً یہ باتیں نقل کر جاتے ہیں، مگر پھر بھی ایسے خیلات کا اظہار تفسیر قرآن میں مناسب نہیں اس لئے کہ اس سے غلط فہمیاں اور شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ (۶۳) اسی طرح امام سیوطی (رح) نے اتقان میں ابن عطاء اللہ کی کتاب "لطائف المنن" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ "صوفیاء نے قرآن و حدیث کی تفسیر میں جو عجیب و غریب معنی بیان کئے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے ظواہر نصوص کو تبدیل کر دیا ہے، بلکہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی ہے جو آیت کے ظاہر سے سمجھ میں آتا ہے اور جس پر عرف لسانی دلالت کرتا ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ آیات و احادیث کے کچھ باطنی رموز و اسرار بھی ہوتے ہیں جو اس شخص پر منکشف ہوتے ہیں جن کا سینہ اللہ نے کھول دیا ہو۔ جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، پس کسی معترض کے یہ کہنے پر کہ یہ قرآن و حدیث کے معانی کو بدل ڈالنے کے مترادف ہے، تم ان حضرات سے ان معانی کے حاصل کرنے سے رک نہ جاؤ، یہ قرآن و حدیث کے معانی سے عدول نہیں ہے، عدول تو اس وقت ہوتا جب یہ کہا جائے کہ اس کے سوا کوئی اور معنی آیت کے نہیں، حالانکہ وہ لوگ (صوفیاء) یہ نہیں کہتے، بلکہ وہ ظاہر کو ظاہر کے مطابق ہی پڑھتے ہیں اور ان سے وہی مراد سمجھتے ہیں جن پر ظاہری الفاظ دلالت کرتے ہیں، ہاں اس کے ساتھ وہ معنی بھی سمجھتے ہیں جسے اللہ انہیں سمجھاتا ہے اور القاء فرماتا ہے۔ (۶۴)

تفسیر اشاری کی قبولیت کے شرائط

حقیقت یہ ہے کہ "تفسیر اشاری" کے قابل قبول ہونے کے لئے چند شرائط کا پایا جانا

ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو اس میں اور فرقہ باطنیہ کی تفسیر باطنی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، چنانچہ صاحب مناہل العرفان نے اپنی تفسیر میں "تفسیر اشاری" پر گفتگو کرتے ہوئے ان شرائط کی وضاحت کی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر اشاری کے قابل قبول ہونے کے لئے درج ذیل شرطیں ضروری ہیں۔

۱---سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تفسیر عربی زبان کے اصول و ضوابط سے متصادم نہ ہو، یعنی جو معنی الفاظ قرآنی کے ظاہر سے سمجھ میں آرہے ہوں، باطنی معنیٰ اس کے خلاف نہ ہوں۔

۲---دوسری شرط یہ ہے کہ کسی شرعی دلیل سے اسکی تائید بھی ہوتی ہو، اور کوئی شرعی یا عقلی بات اس کے معارض نہ ہو،

۳---اس بات کا دعوی نہ ہو کہ قرآن کی مراد بس یہی ہے، ظاہری معنی مراد نہیں،

۴---اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ تفسیر اشاری ظاہری معنی و مراد کی وضاحت کے بعد تبعاً بیان کی جائے تاکہ مخاطب کے دل میں تشویش و اضطراب پیدا نہ ہو،---

آخر میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ شرائط جس تفسیر میں پائی جائیں وہ صرف قابل قبول ہوگی یعنی اسے رد نہیں کیا جائیگا، کیونکہ نہ وہ ظاہر کے منافی ہے اور نہ کوئی دلیل شرعی یا عقلی اس کے معارض ہے، لیکن اس کو واجب التسلیم کسی حال میں نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اسکی بنیاد کشف والہامات ہوتے ہیں، زبان ولغت کا اسمیں کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہ بات مسلم ہے کہ کشف والہام سے جو بات سمجھ میں آئے وہ حجت اور دلیل نیز قابل اتباع و پیروی نہیں۔

****

حواشی

(۱) من اراد علم الاولین والاخرین فلیثور القرآن ، البرہان فی علوم القرآن، النوع الحادی والاربعون ج ۲ ص ۱۵۴

(۲) یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل ارشاد کا جز ہے ، جس کے راوی حضرت علی (رض) ہیں ، ملاحظہ ہو۔ مشکوٰۃ شریف، کتاب فضائل القرآن، الفصل الثانی، ص ۱۸۶

(۳) لسان العرب ج ۵ ص ۵۵

(۴) سورہ نحل آیت ۴۴

(۵) الاتقان فی علوم القرآن ، النوع الثامن والسبعون، ج ۲ ص ۱۷۵

(۶) اسی اصول کی روشنی میں مولانا ثناء اللہ امرتسری (رح) نے عربی زبان میں "تفسیر القرآن بکلام الرحمان" کے نام سے پورے قرآن کی تفسیر کی تھی جو اب نایاب ہے۔

(۷) الاتقان فی علوم القرآن ، النوع الثامن والسبعون، ج ۲ ص ۱۷۶

(۸) سورہ بقرہ آیت ۱۵۱--- آل عمران آیت ۱۶۴

(۹) کل ماحکم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو مما فہمہ من القرآن، الاتقان ج ۲ ص ۱۷۶

(۱۰) الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۹ ، باب تبیین الکتاب بالسنہ وماجاء فی ذلک

(۱۱) حوالہ سابق

(۱۲) ابوداؤد بحوالہ تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۳۷

(۱۳) سورہ توبہ آیت ۳۱

(۱۴) ترمذی ، سنن بیہقی بحوالہ الدرالمنثور فی التفسیر الماثور ج ۴ ص ۱۷۴

(۱۵) سورہ انعام آیت ۸۲

(۱۶) بخاری و مسلم ، ترمذی بحوالہ الدرالمنثور فی التفسیر الماثور ج ۳ ص ۳۰۸

(۱۷) اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل، الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بخاری و مسلم اور ابن حبان وغیرہ نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے ملاحظہ ہو، تفسیر النصوص فی الفقہ الاسلامی ج ۱ ص ۷۰

(۱۸) نعم ترجمان القرآن ابن عباس ، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۷۸

(۱۹) برہان فی علوم القرآن، النوع الحادی والاربعون ج ۲ ص ۱۵۷

(۲۰) الجامع لاحکام القرآن ص ۳۵

(۲۱) الاتقان ج ۲ ص ۱۷۶

(۲۲) ثلاث کتب لا اصل لھا المغازی والملاحم والتفسیر، الاتقان ج ۲ ص ۱۷۸

(۲۳) من قال فی القرآن برایہ فلیتبوأ مقعدہ من النار، بحوالہ تفسیر النصوص فی الفقہ الاسلامی للدکتور محمد ادیب صالح ج ۱ ص ۶۳

(۲۴) من قال فی القرآن برایہ فاصاب فقد اختا . مقد تفسیر کثیر ص ۶ (مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

(۲۵) مقدمہ تفسیر ابن کثیر ص ۶

(۲۶) حوالہ سابق ص ۷

(۲۷) حوالہ سابق

(۲۸) حوالہ سابق

(۲۹) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۴۲- بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین، مولف پروفیسر غلام احمد حریری ص ۲۳۷

(۳۰) مقدمہ تفسیر ابن کثیر ص ۷

(۳۱) بخاری و مسلم عن عبداللہ بن عمرو ابی ہریرہ

(۳۲) ترمذی وابوداؤد عن معاذ بن جبل

(۳۳) اس حدیث کی طرف اشارہ ہے من قال فی

القرآن برایہ فلیتبواء مقعدہ من النار

(۳۴) البرہان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۵۲

(۳۵) مقدمہ تفسیر راغب اصفہانی ص ۴۲۳ بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۴۳۹

(۳۶) البرہان ج ۲ ص ۱۵۴

(۳۷) احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۹۸ بحوالہ تفسیر النصوص فی الفقہ الاسلامی ج ۱ ص ۶۶

(۳۸) حوالہ سابق

(۳۹) اعلام الموقعین ج ۳ ص ۴۶۵ فائدہ نمبر ۵۵ بحوالہ تاریخ افکار و علوم اسلامی ج ۱ ص ۲۵۹

(۴۰) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۶۱

(۴۱) وان صح الحدیث فتاویلہ ان من تکلم فی القرآن بمجرد رایہ ولم یعرج علی سوی لفظہ واصاب الحق فقد اخطاء الطریق واصابتہ اتفاق اذا الغرض انہ مجرد رای لاشاہد لہ، الاتقان ج ۲ ص ۱۸۰

(۴۲) تفسیر النصوص فی الفقہ الاسلامی ج ۱ ص ۴۷

(۴۳) مقدمہ اصول تفسیر ص ۳۱

(۴۴) ابوداؤد عن معاویہ، ترمذی عن عبداللہ ابن عمر

(۴۵) وجوہ یومئذ ناظرہ، الی ربہا ناظرہ، سورہ قیامہ آیت ۲۲-۲۳

(۴۶) وکلم اللہ موسی تکلیما -- سورہ نساء آیت ۱۶۴

(۴۷) مقدمہ اصول تفسیر ص ۲۴

(۴۸) تاویل مختلف الحدیث ص ۸۴ بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۳۶۷

(۴۹) حوالہ سابق

(۵۰) تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۴۶۴

(۵۱) الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۸۴

(۵۲) الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۸۵

(۵۳) فما لہولاء القوم لایکادون یفقہون حدیثا، سورہ نساء -- آیت ۷۸

(۵۴) ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی -- سورہ نصر

(۵۵) الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا -- (مائدہ --- ۳

(۵۶) روح المعانی ج ۶ ص ۶۰

(۵۷) تفسیر القرآن از تستری ص ۴۱ بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۵۴۴

(۵۸) حوالہ سابق ص ۹ بحوالہ تاریخ تفسیر ص ۵۴۳

(۵۹) لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی ولا علی الذین لایجدون ماینفقون حرج اذا نصحوا للہ ورسولہ ما علی المحسنین من سبیل واللہ غفور رحیم، بیماروں اور ان لوگوں پر جو خرچ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ وہ اللہ و رسول کے لئے خلوص رکھیں، محسنین پر کوئی حرج نہیں اور اللہ بہت زیادہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ آیت ان مخلص صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کسی شدید عذر کی وجہ سے غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوسکے تھے

(۶۰) عرائس البیان ج ۱ ص ۳۳۹ بحوالہ تاریخ تفسیر ص ۵۶۴

(۶۱) کون ہے جو اللہ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کرے

(۶۲) الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۸۴

(۶۳) حوالہ سابق ص ۱۸۵

(۶۴) حوالہ سابق

بخاری شریف کی آخری حدیث

مولانا زبیر احمد قاسمی، شیخ الحدیث دار العلوم سبیل السلام

ذیل میں حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم سبیل السلام کی بخاری شریف کی آخری حدیث پر کی جانے والی تقریر کیسٹ کی مدد سے قارئین کی نذر کی جارہی ہے جو مولانا موصوف نے شعبان سنہ ۱۴۰۹ھ میں ختم بخاری شریف کے موقعہ پر دار الحدیث دار العلوم سبیل السلام میں علماء، معززین شہر اور اساتذہ و طلبہ کی موجودگی میں کی تھی۔

(ادارہ)

میرے عزیز طالب علمو! آپ نے ابھی بخاری شریف کا آخری باب اور اس کی آخری حدیث پڑھی ہے، میرے لئے اور آپ کے لئے سال کا گویا آخری درس ہو رہا ہے، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں حسب دستور تدریسی انداز اختیار کر کے اس باب کے مضمون اور عنوان کی وضاحت و تشریح اور پھر حدیث پاک کے معانی و مطالب اور اس سے حاصل شدہ ہدایت و رہنمائی کے بیان و تفصیل کو آپ کے سامنے رکھتا ۔۔۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجلس محض ایک مجلس درس ہی نہیں ہے، بلکہ درس بخاری کی اختتامی تقریب کے نام پر منعقدہ ایک عام اجلاس بھی ہے، جس کے شرکاء صرف آپ جیسے طلباء ہی نہیں ہیں بلکہ علماء فضلاء کی بھی ایک جماعت تشریف فرما ہے، دوسرے طبقہ کے اہل علم دانشور حضرات بھی موجود ہیں اور پھر عام مسلمانوں کی ایک خاص جمعیت بھی ہے، جن کے قلوب حدیث رسول ص کی محبت سے لبریز ہیں اور انہیں بھی بخاری شریف کی آخری حدیث کے درس میں شرکت کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے، ظاہر ہے کہ ان مختلف طبقات اور مختلف ذہنی و فکری سطح کے حاضرین کے سامنے ہمیں بات بھی کچھ اس طرح کرنی ہوگی جس میں سبھوں کے مذاق اور ذہنی سطح کی رعایت ہو جائے، صرف علمی اور فنی حیثیت کی گفتگو ممکن ہے، کسی کے حق میں گرانبار خاطر ہو اور وہ اکتاہٹ محسوس کریں، اس لئے ہماری کوشش ہوگی اور اللہ ہماری مدد فرمائے کہ آج کا درس تمام ہی حاضرین کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں قابل توجہ اور باعث کشش بن جائے، ہو حسبی ونعم الوکیل۔

تشکر و امتنان و ہدیۂ تبریک

میرے عزیزو! سب سے پہلے تو میں اپنے خالق و مالک اور منعم حقیقی کا شکریہ ادا کر رہا ہوں، جس نے محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس کا موقع بخشا کہ پیارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی احادیث پاک پڑھنے پڑھانے میں اپنے آپ کو مشغول رکھ سکا، سال گذر چکا اس سال کے اکثر مہینے اور مہینوں کے اکثر ایام قال اللہ و قال الرسول کے ورد زبان رکھنے ہی میں بیت گئے --- یہ اللہ ہی کی عنایتیں، نوازشیں اور ان ہی کی بخشی ہوئی توفیق و ہمت تھی جن کے سہارے آج اس مشہور زمانہ کتاب بخاری جس کا اصل اور مکمل نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و سننہ وایامہ" ہے، اس کی آخری حدیث تک کے درس کا شرف مل رہا ہے فللہ الحمد والمنہ کہ

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

اس کے بعد میرے عزیزو! میں آپ لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں، آپ کے سرپرست و مربی کو تہنیت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے دین کی محبت میں اس کی حفاظت و خدمت اور اشاعت میں سہیم و شریک ہونے کے لئے دینی علوم کی تحصیل کو ترجیح دیا ہے اور اپنے قیمتی اوقات کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے فارغ رکھا ہے اور اپنی ہر ممکنہ کوشش کے ساتھ دینی علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد حیات بنائے رکھا، آپ یقیناً اس لائق ہیں کہ آپ کو مبارکباد دی جائے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ کے حوصلہ کو بلند رکھے اور اب تک کے تعلیمی ایام میں جس حد تک بھی علم کی راہ پر چلنے اور آگے بڑھنے کا طریقہ و سلیقہ آیا ہے، اس سے کام لیکر اپنے دامن مراد کو علم کی موتیوں سے بھرنے اور بھرتے رہنے کی ہمت و توفیق بخشے، سدا "فوق کل ذی علم علیم" پیش نظر رہے، علم کی راہوں میں قناعت نہیں بلکہ "ہل من مزید" کی حریصانہ صدا ہی مطلوب رہے۔ اس کے ساتھ آپ کے سرپرست و مربی بھی لائق مبارکباد ہیں جنہوں نے اپنی دینی حس کی بیداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے آپ کو دین کی بنیادی کتاب، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تعلیم و تعلم کے لئے وقف کر دیا، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ سے ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے اور انہیں مبارکباد نہ کہا جائے جن کی ہمت و محنت جانسوزی اور دینی تڑپ کے نتیجے میں یہ "دار العلوم سبیل اسلام" مختصر ترین عرصہ میں ترقی کے زینے طے کرتا ہوا، عروج کی اس منزل پر ہپونچا ہے کہ آج اس کے احاطہ میں ختم بخاری شریف کی بابرکت تقریب منعقد ہو سکی ہے۔ آج اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا، تعلیم و تعلم کا یہ نظم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ نہ آپ لوگ ہم کو دیکھتے اور نہ ہم آپ کو دیکھتے اور نہ اس تقریب کے انعقاد کا کوئی موقع ہوتا۔ اس لئے ہم سب کو شکر گذار ہونا چاہیئے ان شخصیتوں کا اور مبارکباد کہنا چاہیئے ان ہستیوں کو جنکی مسلسل محنت اور جفاکشی کے نتیجے میں، اس دار العلوم

سبیل السلام کو بام عروج پر چڑھنا نصیب ہوا ہے ---- یہ ہمارے جواں ہمت ناظم مولانا رضوان القاسمی اور بلند حوصلہ پر عزم صدر مجلس انتظامیہ الحاج ضیاء الرحمان صاحب بالخصوص لائق ستائش اور مستحق مبارکباد ہیں جنکی توجہات اور مخلصانہ جد وجہد کے ثمرات ونتائج ہمارے سامنے آتے ہیں، اللہ ان تمام حضرات کو جن کی ذہنی وفکری کاوشوں، جسمانی محنتوں مالی اعانتوں اور نیک دعاؤں کے طفیل مدرسہ سبیل السلام کو ترقی نصیب ہوئی ہے۔ دین و دنیا میں بہتر صلہ اور جزائے خیر سے نوازے آمین۔

ختم بخاری پر جشن و تقریب کیوں؟

تمام دینی درسگاہوں میں مختلف علوم و فنون کی کتنی ہی کتابیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں، لیکن اب تک کہیں یہ دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا کہ کسی کتاب کے آغاز واختتام پر باضابطہ کسی تقریب و جشن کا اہتمام کیا جاتا ہو، لیکن بخاری شریف ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے لئے سال کے شروع اور آخر میں افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے انعقاد کا تقریباً سارے ہی مدارس میں ایک دستور سا چل پڑا ہے، آخر کیوں؟ ہمارے خیال میں اس کا جواب کوئی زیادہ پیچیدہ نہیں، کون نہیں جانتا کہ کتاب اللہ جو دین اسلام کی بنیادی کتاب ہے اس کے بعد اس روئے زمین پر اگر کوئی کتاب ہو سکتی ہے جسے قرآن پاک کے قریب تر کہا جاسکے تو بس یہی ایک کتاب ہے جسے علماء اسلام متفقہ طور پر "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہتے ہیں، محدثین کہتے ہیں--

الاجماع حاصل علیٰ تسلیم صحته و تلقت الامته بالقبول بکتابه الصحیح الجامع

بخاری شریف کی صحت اجماعی طور پر مسلمہ ہے اور پوری امت کے نزدیک یہ صحیح بخاری مقبول کتاب ہے

چنانچہ صحیح بخاری میں جن راویوں سے امام بخاری نے روایت نقل کر لیا، ان رواۃ کی تعدیل و توثیق پر ایک مہر ثبت ہو گئی اور تعدیل بخاری کے بعد رواۃ پر کسی کا طعن اور جرح مبہم متعبر بھی نہیں ہوتا۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ کتاب بخاری کی نسبت سے اس طرح کی تقریبوں کا انعقاد دراصل اس کی صحت و عظمت کا امت کی طرف سے ایک عملی اعتراف اور اعلان ہے اور اس کی منفرد خصوصیات کی اجتماعی انداز سے تسلیم و شہادت ہے۔

بخاری شریف کی عظمت کے اسباب

بلاشبہ بخاری شریف احادیث رسول کی ایک جامع کتاب ہے اور "ملوک الکلام کلام الملوک" کے قاعدہ معروفہ کے تحت یہ سارے کلاموں سے عظیم الشان کلام پر مشتمل ہے، کیونکہ یہ کلام ہی

اس عظیم شخصیت کا ہے جو شاہوں کا شہنشاہ ہے، صلی اللہ علیہ و سلم۔ مگر یہ وصف تو دیگر کتب احادیث میں بھی مشترک ہے، اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کتاب بخاری کی عظمت شان کی دلیل صرف یہی ایک امر نہیں ہے کہ وہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا صحیح ترین مجموعہ ہے، بلکہ اس لئے بھی یہ کتاب عظیم سمجھی جاتی ہے کہ یہ دراصل ایک شیخ وقت جلیل القدر محدث کی خواہش اور تمنا کی تکمیل اور ایک مبارک خواب کی حسین تعبیر ہے --- محدثین کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ایک موقعہ سے امام بخاری کے شیخ اسحق بن راہویہ نے اپنے تلامذہ کے سامنے اپنی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا---

لو جمعتم کتابا مختصراً فی الصحیح لسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم

اے کاش اگر تم میں سے کوئی ایسی مختصر کتاب کی تالیف کر دیتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی احادیث صحیحہ پر مشتمل ہوتی تو اچھا ہوتا۔

کہتے ہیں کہ شیخ کی اس تمنا کو سنتے ہی امام بخاری علیہ الرحمہ کے دل میں اس کی تحریک ہوئی اور پھر اسی دوران خود امام بخاری نے ایک خواب دیکھا---

قال رائیت النبی فی المنام کانی و اقف بین یدیہ و بیدی مروحہ اذب عنہ فقال المعبرون تذب عنہ الکذب فحملنی علیٰ اخراج الصحیح

فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں رسول اللہ کے سامنے پنکھا لئے کھڑا ہوں اور جھل کر مکھیاں اڑا رہا ہوں، تعبیر خواب کے علماء نے تعبیر دی کہ آپ احادیث رسول اللہ سے جھوٹ کو الگ کریں گے اس تعبیر خواب نے احادیث صحیحہ کے جمع کرنے پر ہمارے ارادہ کو مزید مضبوط کر دیا۔

چنانچہ امام بخاری نے اس صحیح بخاری کی تالیف و ترتیب کا کام شروع کر دیا، پھر امام صاحب نے اس کام کا آغاز بھی اس مبارک مقام پر کیا اور احادیث کے اخذ و انتخاب میں بھی ایسا طرز عمل اپنایا جس نے اس کتاب کی عظمت میں مزید چار چاند لگا دئے، امام بخاری سے نقل کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں---

صنفت کتابی الجامع فی المسجد الحرام و ما ادخلت فیہ حدیثاً حتی استخرت اللہ تعالیٰ و صلیت رکعتین و تیقنت صحتہ

میں نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" کی تالیف کا آغاز مسجد حرام میں کیا اور جب تک دو رکعت نماز پڑھکر دعا و استخارہ کر کے حدیث کی صحت کا یقین نہیں ہو جاتا تب تک، کسی حدیث کو اس میں جمع نہیں کرتا۔

ظاہر ہیکہ اس مخصوص اہتمام کے نتیجے میں یقیناً یہ کتاب اس لائق ہو سکتی ہے جس کا اعتراف

آج پوری امت مسلمہ کر رہی ہے بلکہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس کتاب بخاری کو عظیم الشان اور رفیع القدر بنانے میں خود مؤلف کتاب کی جلیل القدر شخصیت ان کے حسن نیت، کمال زہد و تقویٰ اور عدالت و دیانت کو مجروح کر دینے والے معمولی شبہات سے غایت درجہ کے احتیاط و اجتناب کو بھی دخل ہے۔

امام صاحب کے احتیاط کا ایک عبرت آموز واقعہ نقل کیا جاتا ہیکہ ایک بار امام صاحب دریائی سفر میں تھے ایک ہزار اشرفیاں ان کے پاس تھیں ایک شخص نے رفیق سفر بن کر عقیدت مندانہ راہ و رسم پیدا کر کے اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا۔ امام نے ان اشرفیوں کی اطلاع بھی اسے دیدی تھی، اس کے دل میں لالچ پیدا ہوئی اور ایک صبح سو کر اٹھا تو باآواز بلند رونا پیٹنا شروع کر دیا، لوگوں نے باصرار جب پوچھا تو بتلاتا ہے کہ میری ایک ہزار اشرفیاں گم ہیں، آخر جہاز کے تمام مسافروں کی تلاشی لی جانے لگی امام صاحب نے یہ دیکھکر تھیلی سمندر میں ڈال دی اور اس طرح وہ تھیلی کسی کے پاس سے بھی برآمد نہ ہونا تھی نہ ہوئی، لوگ اسے جھوٹا کہکر شرمندہ کرنے لگے۔ آخر سفر ختم ہوا، جہاز سے سارے مسافر اتر کر اپنی منزل کی طرف چلے، وہ شخص امام صاحب کے پاس آتا ہے اور اشرفیوں کے متعلق دریافت کرتا ہے، جواب ملتا ہے کہ اسے میں نے سمندر میں پھینک دیا تھا، اس نے کہا کہ اتنی بڑی رقم کا ضائع کرنا آپ نے کیسے گوارا کر لیا؟

امام صاحب جو جواب دیتے ہیں، دراصل یہی سننے اور عبرت پذیری کی چیز ہے، فرماتے ہیں کہ عدالت و ثقاہت کی جس دولت کو میں نے عمر عزیز گنوا کر حاصل کیا تھا، اسے چند اشرفیوں کے بچانے کی خاطر کیسے برباد کر دیتا، اگر وہ تھیلی تلاشی کے بعد میرے پاس نکل آتی اور میری بات پر اعتماد کر کے سارے لوگ اس تھیلی کا اصل مالک ہمیں تسلیم بھی کر لیتے تاہم کسی دل میں یہ شبہ ضرور پیدا ہو جاتا کہ ممکن ہے کہ مدعی ہی سچا ہو اور اس طرح میری صداقت مجروح ہو جاتی اور میری عدالت و ثقاہت کے دامن پر داغ پڑ جاتا

اس واقعہ سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ امام صاحب کی زندگی تقویٰ کے کس معیار اور دیانت و احتیاط کے کس درجہ پر فائز تھی۔ وقت میں اتنی گنجائش کہاں کہ امام صاحب کے حالات و سوانح کا ایک مختصر سا خاکہ بھی پیش کیا جائے۔ حاصل یہی ہے کہ امام صاحب اپنی مختلف النوع حیثیات و خصوصیات میں ایک انفرادی شان کے مالک اور اپنی مثال آپ تھے

کہنے والے نے امام صاحب کی تاریخ ولادت "صدق" سے مدت حیات "حمید" سے اور سال وفات "نور" کے الفاظ سے نکالے ہیں، میرے خیال میں یہ منجانب اللہ الہامی الفاظ ہیں۔ گویا امام صاحب کی ولادت دراصل دنیا میں صدق و صفائی، سچائی اور راست بازی کا ظہور تھی، ساری زندگی دنیا کی نظر میں لائق ستائش، قابل تعریف اور محمود بن کر رہے اور جب وفات ہوتی ہے تو اپنے عمل صالح اور عظیم کارنامے سے اپنے قلب و نظر اور پوری زندگی کو روشن و تابناک بنا کر ایک نور بنکر اپنے خالق کے پاس جا پہونچتے ہیں

آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

احادیث رسول کی دینی حیثیت

حضرات سامعین، علماء کرام اور میرے عزیزو! ابھی آپ متعدد علماء کرام سے احادیث رسول اللہ کے شرف و عظمت اور ان کی دینی حیثیت کے متعلق بڑی تفصیل سے قیمتی باتیں سن چکے ہیں میں اس موقعہ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ علماء نے جو احادیث رسول اللہ کو کتاب اللہ کی کبھی تقریر و تاکید کہا ہے جبکہ دونوں کے مضامین اور دونوں سے حاصل شدہ حکم و ہدایت ایک ہی ہوں اور کبھی اسے مبہمات قرآنی کے لئے ایضاح، مجملات قرآنی کے لئے تفصیل اور مشکلات قرآنی کے لئے تفسیر کہا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ دین کی اساس اور ابتدائی بنیاد دراصل یہی دو چیزیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول جیسے کتاب اللہ سے اعراض تغافل کسی کو بے دین بنا دیتا ہے، اسی طرح سنت رسول اللہ سے کٹنا اور صرف نظر کرنا اس کی بے دینی و بد دینی کے لئے کافی ہے، ایک مسلم کے لئے اس سچائی سے انکار کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں کہ سنت رسول اللہ کی تعلیم اور اس کی تعمیل ایک مومنانہ زندگی کے لئے لازمی عنصر ہے، احادیث رسول اللہ سے رخ موڑ کر کوئی حیوانی زندگی گذارنا چاہے تو گذار لے، مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی کو مومنانہ کیا ایک انسانی زندگی بھی بنا سکے، "صلوا کما رایتمونی اصلی" (جیسے تم ہمیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو تم بس اسی طرح نماز پڑھا کرو) جیسی ہدایت اگر سنت رسول اللہ سے اپنے سامنے نہ رکھی جائے تو کیا نماز جیسی اہم اور دین کی ستون کی حیثیت رکھنے والی عبادت بھی کسی سے انجام پا سکتی ہے؟ علی ہذا القیاس اسلام کے دیگر ارکان روزہ حج زکاۃ کی تکمیل و تعمیل بھی سنت رسول اللہ سے حاصل کردہ روشنی کے بغیر ناممکن ہے، تفصیل کی وقت میں گنجائش نہیں --- تاہم اس سلسلے کا ایک اہم نکتہ بیان کر دینا بہر حال ضروری سمجھتا ہوں تاکہ کسی موقعہ سے حدیث کی مراد سمجھنے میں غیر شعوری طور پر غلطی نہ ہو جائے۔

مقصد احادیث کا تنوع

آپ اگر غور کریں گے اور شارع علیہ السلام کی حدیث پاک کے حقیقی مقصد و مراد تک پہونچنے کی کوشش کریں گے تو محسوس ہوگا کہ سنت رسول اللہ اپنے مقصد و مراد کے اعتبار سے دو قسموں پر منقسم ہے۔

بعض حدیثیں تو ایسی ہیں کہ اس کا مقصد تشریع حکم ہی ہے۔ یعنی رسول اللہ بتلا رہے ہیں کہ فلاں صورت حال سے جب سابقہ پڑ جائے تو اس حالت میں حکم یہ ہے اور اس کی تعمیل و بجا آوری ضروری ہے مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ---

جس کو نماز میں قے آجائے یا نکسیر پھوٹ جائے تو نماز سے نکل کر وضو کرے اور پھر ادا شدہ رکعتوں کو صحیح سمجھتے ہوئے باقیماندہ رکعتوں کو بنا کر کے نماز مکمل کر لے۔

اس حدیث کا مقصد ہی تشریع حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بتلانا چاہتے ہیں کہ اگر اس طرح کی صورت حال سامنے آجائے تو شریعت کا حکم ہی یہ ہے کہ وہ نماز سے نکل آئے، وضو کی تجدید کرے اور پھر باقیماندہ رکعتوں کو ادا کر کے نماز مکمل کر لے، لیکن ذخیرہ احادیث میں بعض ایسی حدیثیں بھی ہیں جن کا مقصد حتمی حکم مقرر کرنا نہیں بلکہ فیصلہ کا اختیار دینا ہے، یعنی فلاں صورت حال میں فلاں طرح کے حکم شرعی کی تعیین و تقریر کی اجازت دی جاتی ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں---

جس نے میدان جہاد میں کسی کافر کو قتل کیا تو مقتول کا سامان اسی کا ہے۔

اس حدیث کا مقصد لازمی انداز سے کسی حکم شرعی کا بیان نہیں ہے کہ ہر قاتل مقتول کے سامان کا بہر حال حقدار قرار دیا جائے، بلکہ امام و خلیفہ اور سپہ سالار لشکر کو اجازت دی جا رہی ہے کہ اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو ترغیب و تحریص اور مجاہدوں کی طبیعت میں جوش و امنگ پیدا کرنے کے لئے اس طرح کا اعلان و وعدہ کیا جا سکتا ہے اور اعلان کے بعد مقتول کے سامان کو غنیمت میں جمع کرنے کے بجائے قاتل کو اس کے حسن خدمات کے طور پر دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے---

من احییٰ ارضاً میتتہ فھی لہ

جس نے کسی ناقابل کاشت مردہ زمین کو قابل کاشت بنایا تو اس زمین کا مالک اسی کو قرار دیا جائے

جاننے والے جانتے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ رسول اللہ کی ایک دوسری حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد حکم کی تعیین نہیں، بلکہ موقع و حالات کے تحت اس کی گنجائش فراہم کرنا ہے، اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کی ایک حدیث اس سلسلے میں یہ بھی آتی ہے---

لیس للمرء الا ما طابت بہ نفس امامہ

یعنی مباحات میں سبقت کے باوجود وہی چیز انسانوں کی ملک ہو سکتی ہے جس کی اجازت امام وقت کی خوش دلی سے حاصل ہو چکی ہو۔

اس لئے " من احیی ارضا میتتہ۔ کا مطلب و مقصد بھی یہی قرار دیا جائے کہ اس حدیث سے

دراصل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم امام وقت کو اجازت دیتے ہیں کہ اگر کسی ارض موات کو تمہاری اجازت سے کوئی زندہ کرلے تو تم اسے اس زمین کا مالک قرار دے سکتے ہو۔ بہر حال! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سنت رسول اللہ سے صحیح مفہوم اخذ کرتے وقت اکابر ملت اور سلف کی تشریحات و توضیحات کو یقیناً سامنے رکھنا ہوگا، ورنہ قدم جادہء مستقیم سے ہٹ سکتا ہے۔ اللہم احفظنا واہدنا الصراط المستقیم۔

بخاری شریف کی آخری حدیث

عن ابی ہریرہ (رض) قال قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم

گو وقت کم ہے، زیادہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ملتا، تاہم خوش قسمتی یہی ہے کہ یہ آخری حدیث بھی آپ لوگوں کے لئے نئی نہیں ہے، یہی حدیث پچھلے مختلف ابواب میں کلمات کے تقدم و تاخر اور معمولی سی ترتیب کلمات کی تبدیلی کے ساتھ گذر چکی ہے، کتاب الایمان والحدود اور کتاب التسبیح میں اس روایت کے الفاظ گذر چکے ہیں اور وہاں اس پر کلام بھی ہو چکا ہے اسلئے آجکی مختصر گفتگو بھی انشاء اللہ کافی رہے گی۔

امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کا آخری باب "باب قول اللہ عزو جل و نضع الموازین القسط لیوم القیمتہ" منعقد کیا ہے اور سب سے پہلا باب "باب الوحی" تھا، پھر ایمان و علم اور اعمال کے مختلف ابواب کے ذریعہ وحی کی صداقت و عظمت، ایمان کی حقیقت اور اعمال کی ضرورت وغیرہ کو جب بیان کرچکے تو اس آخری باب کے ذریعہ ہم لوگوں کے ذہن میں یہ تصور پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ اس کتاب کی پہلی حدیث وحی غیر متلو "انما الاعمال بالنیات" کی روشنی میں اپنے ایمان اور علم و عمل کا جائیزہ لیتے ہوئے اسے وحی الہی کے عین مطابق پائیں تو زہے قسمت، فللہ الحمد والمنتہ ورنہ اب بھی موقع ہے کہ تصحیح نیت کے ساتھ تلافی مافات کرلیں

کیونکہ "من مات قامت قیامتہ" جو مر گیا اسکے حق میں اسکی قیامت بھی آگئی اور اللہ کا اعلان سن ہی رہے ہیں کہ ھم قیامت کے دن میزان اعمال کے ذریعہ بنی آدم کے اعمال واقوال کا وزن کریں گے، تو قبل اس کے کہ وہ دن آنے اور ہمارے اعمال واقوال اس میزان میں تو لے جائیں، وحی الہی اور سنت رسول اللہ کی شکل میں جو ہمارے پاس اپنے اقوال و اعمال کو تولنے اور پیمائش کا ایک آلہ و ذریعہ اس دنیا میں موجود ہے اس سے اپنے عمل کو کیوں نہیں تولتے جائیں۔

وحی الہی اور سنت رسول دراصل ایک میزان ہے

مسلمان اپنے قول و عمل میں ہر گز کبھی آزاد نہیں ہوتا، اسکی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنے سامنے وہ ہمیشہ سنت رسول کی کسوٹی رکھے اور اپنے ہر قول و عمل کو اسی پر کستار ہے، میرا وہی قول و عمل صحیح اور عند اللہ موجب اجر و ثواب ہو سکتا ہے جو سنت رسول کی میزان پر پورا اتر جائے ہم بظاہر خواہ کتنا ہی اچھا اور عمدہ کام کریں لیکن وہ سنت رسول کی ہدایت کے خلاف ہو تو وہ کار ثواب نہیں بلکہ سبب عقاب ہی ہوتا،

دیکھئے نماز کیسی اہم عبادت کتنا عمدہ فعل ہے جس کے تارک کو کافر اور ھادم دین تک کہا گیا ہے لیکن یہی نماز اگر آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پڑھی جائے تو چونکہ یہ سنت رسول اور فرمان نبی کے خلاف ہوگی اسلئے عند اللہ مقبول نہیں بلکہ مردود قرار پائے گی، روزہ ایک فریضہ ہے عمدہ اثرات و نتائج کا حامل ہے، لیکن یہی روزہ عیدین کے دنوں اور ایام تشریق میں رکھے جائیں تو ایک گناہ اور معصیت کا کام کہلائیگا کیونکہ یہ روزہ دراصل سنت رسول کے خلاف ہوگا خلاصہ یہ کہ ایک مومن کے لئے ہر آن ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے احادیث رسول کی کسوٹی رکھے اور اپنے ہر قول و عمل اور عادات و اطوار کو اس معیار پر جانچتا رہے۔

امام بخاری نے سنت رسول کا ایک عظیم اور صحیح ترین مجموعہ ہمارے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس آخری باب کو منعقد کر کے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ ہم اپنے تمام اقوال و اعمال کو اسی میزان پر تولتے رہیں "جزاہ اللہ خیر الجزاء"

ترجمۃ الباب اور آیت قرآنی کی تشریح

اللہ تعالی فرماتے ہیں "نضع الموازین القسط لیوم القیامۃ" قیامت کے دن ہم میزان عدل قائم کریں گے یہاں "لیوم القیامۃ" میں لام بمعنی "فی" ہے، بعض حضرات تعلیل کے معنی میں مانتے ہیں، یعنی قیامت کیدن کے حساب کے لئے میزان عدل رکھیں گے۔ آگے بخاری فرماتے ہیں "وان اعمال بنی ادم واقوالھم توزن" یقیناً سارے بنی آدم کے اعمال و اقوال تولے جائیں گے، یہاں اعمال کے از قبیل اعراض ہونے کے سبب مشہور اشکال اور پھر اس کے جواب کی بات کی جاتی ہے۔ مگر میرا خیال ھیکہ اب دور حاضر میں نہ اس اشکال کا موقع رہا اور نہ جواب و توجیہ کی کوئی ضرورت، ہم آئے دن اعراض کے تولے جانیکا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، معتزلہ حضرات کی عقل میں اعراض کے تولنے کا امکان نہ آسکا اور وزن اعمال کے منکر ہو گئے، جبکہ بعض احادیث سے یہاں تک ثابت ہوتا ہے کہ اعمال کو مجسم بنا دیا جائیگا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں

ان اللہ تعالیٰ یقلب الاعراض اجساما فیزنہا

اللہ تعالی اعمال و اعراض کو اجسام و جواہر کا روپ دیں گے، پھر اسے تولیں گے۔

اور بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان اعمال کے صحیفے اور دفاتر تولے جائیں گے، چنانچہ ایک روایت ہے، جسے امام ترمذی نے "حسن غریب" کہتے ہوئے نقل کیا ہے اور ابن حبان، حاکم، ابن ماجہ اور بیہقی نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرو العاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالی تمام خلائق کے سامنے میری امت میں سے ایک شخص کو منتخب کریں گے اس کے سامنے ننانوے نامہ اعمال بڑے بڑے دفاتر کی شکل میں پھیلا دیئے جائیں گے اور اللہ تعالی پوچھیں گے کہ کیا تمہیں اس میں سے کسی دفتر کا انکار ہے؟ اور کیا تم کہہ سکتے ہو کہ میرے کراماً کاتبین نے تم پر ظلم پر کیا ہے، وہ شخص کہیگا، نہیں میرے رب! --- اللہ کہیں گے، کیا تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی عذاداری ہے وہ کہیگا "لایارب" نہیں میرے رب، یہ سارے ہی دفاتر گناہوں اور عدول حکمیوں کے ہوں گے، وہ شخص لرزاں و ترساں ہو گا کہ اللہ تعالی فرمائیں گے! بلی، ان لک عندنا حسنتہ" ہاں ہاں تمہاری ایک نیکی میرے پاس محفوظ ہے اور پھر ایک چھوٹا سا پرزہ جس میں "اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ" ہو گا، سامنے لائیں گے اور اس شخص سے کہا جائیگا کہ آو اپنی موجودگی میں عمل تولاؤ وہ کہیگا کہ اے میرے رب اتنے بڑے بڑے دفاتر کے سامنے اس چھوٹے سے پرزہ کی کیا حقیقت ہوگی مگر اللہ تعالی فرمائیں گے "فانک لا تظلم" تم پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے بعد میزان کے ایک پلڑے میں وہ سارے دفاتر اور دوسرے پلڑے میں وہ چھوٹا سا پرزہ رکھا جائیگا اور یہی پرزہ والا پلڑا بھاری نکلیگا اور وہ ناجی قرار پائیگا۔

ظاہر ہے کہ ایسی روایتوں کے رہتے ہوئے وزن اعمال کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور آج تو یقیناً یہ انکار مضحکہ خیز ہی کہا جا سکتا ہے، اسلئے وزن اعمال کی کیفیت سے قطع نظر اہل سنت و الجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ!

والوزن یومئذ الحق قیامت کے دن وزن اعمال ایک حق و ثابت امر ہے

قرآن نے الموازین القسط کہا ہے، یہاں نحوی طور پر موصوف "الموازین" اور صفت "القسط" کے درمیان مفرد اور جمع ہونے کے اعتبار سے عدم مطابقت کا اشکال کیا جاتا ہے تو بعض حضرات اسطرح جواب دیتے ہیں کہ "القسط" مصدر ہے اور مصدر علی الاطلاق واحد ہی مستعمل ہوتا ہے اور اس کا اطلاق قلیل و کثیر سب ہی پر ہوتا ہے اور بعض حضرات یوں کہتے ہیں کہ گو لفظ "موازین" جمع ہے، مگر مراد واحد ہی ہے کیونکہ میزان عمل در حقیقت ایک ہی ہو گا، اس واحد کی تعبیر بلفظ جمع محض عظمت شان کے اظہار کے لئے کی گئی ہے، کیونکہ ایسا استعمال عرب میں عام ہے کہ عظمت شان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے واحد کی تعبیر بصیغتہ جمع کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن ہی میں حضرت ابراھیم علیہ السلام پر امت کا لفظ بولا گیا ہے اور "کذب قوم نوح المرسلین" میں

ایک حضرت نوح کو بصیغہ جمع "المرسلین" سے بیان کیا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ یہاں بحث کی جاتی ہے۔ جو اپنی جگہ موجود ہے، آپ لوگ دیکھ لیں گے --- پھر "القسط" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ مصدر ہے معنی میں "مقسط" کے ہے پھر شبہ ہوتا ہے کہ مقسط کا مصدر اقساط ہوتا ہے، "قسط" نہیں اور جواب دیا جاتا ہے کہ یہ مصدر محذوف الزوائد ہے۔ لغوی طور پر قسط کے معنی عدل و جور دونوں ہی آتے ہیں، اس لئے اسے بعض حضرات اسماء اضداد میں شمار کرتے ہیں، لیکن اتنی بات بہر حال معروف ہے کہ قاسط عموماً ظالم و جائز اور مقسط عادل کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، قرآن نے کہا "ان اللہ یحب المقسطین" کہ اللہ انصاف پسندوں کو محبوب رکھتا ہے اور فرمایا "واما القاسطون فکانوا لجہنم حطباً" کہ ظالم لوگ جہنم کی ایندھن ہوں گے، خود لفظ عادل بھی تقریباً اسماء اضداد میں داخل ہے۔

لفظ قاسط و عادل سے متعلق ایک پر لطف واقعہ

کہا جاتا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی مشہور ظالم نے ایک دفعہ مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر کو اپنے پاس بلوایا اور کہا "ماتقول فی" تم میرے متعلق کیسی رائے رکھتے ہو اور میرے متعلق کیا کہتے ہو؟ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا "انت قاسط عادل" عام حاضرین نے یہی سمجھا کہ سعید بن جبیر حجاج کو عادل و انصاف پسند کہہ رہے ہیں اور اس پر سبھوں کو حیرت بھی ہوئی کہ سعید بن جبیر جیسے حق پسند، حق گو حجاج جیسے گورنر کو انصاف پسند ہونے کے سرٹیفیکٹ کیسے دے رہے ہیں، یہ تو صریح کم ہمتی اور مداھنت و تملق ہے، مگر خود حجاج جو اہل زبان اور انتہائی فصیح بلیغ شخص تھا وہ سمجھ گیا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہو کے کہنے لگا، اے کم بختو! تو لوگوں نے کچھ نہیں سمجھا، انہوں نے دراصل ہمیں ظالم و کافر بنا دیا کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا ہے۔

اماالقاسطون فکانوا لجہنم حطبا" اور "ثم الذین کفروا بربھم یعدلون" گویا اسی قسط سے مشتق یہ قاسط اور عدول سے مشتق یہ عادل ہے، جیسے جہنم کا ایندھن اور کافر کہا گیا ہے۔

حدیث باب کے متعلق مختصر گفتگو

اس حدیث پاک کو ترجمۃ الباب سے ربط و مناسبت تو ظاہر ہے، جب تک وضع میزان اور وزن اعمال و اقوال نہیں ہوگا، دو کلمہ خفیفہ کا میزان میں ثقیل ہونا کیسے سمجھ میں آئیگا، گویا کلمتان خفیفتان اور ثقیلتان فی المیزان سے ترجمہ کا جزو اول وضع میزان اور جزو ثانی کا ایک حصہ وزن اقوال تو صراحتاً ثابت ہو رہا ہے اور حصہ ثانی وزن اعمال دلالتہ اور ضمنا۔

حدیث میں رسول اللہ فرماتے ہیں "کلمتان خفیفتان" یہاں کلمہ نحوی اور اصطلاحی نہیں بلکہ بمعنی لغوی ہے یعنی کلام اور ہر وہ بات جو زبان سے نکلے یعنی دو کلمہ جو زبان پر آسانی سے

چڑھ جاتے ہیں، ادائیگی میں کوئی ثقالت نہیں بلکہ ہلکے پھلکے انداز سے ادا ہو جاتے ہیں چونکہ اس کے حروف بھی کم ہیں اور پھر ان حروف کے فن تجوید کے قاعدہ کے مطابق اوصاف بھی ایسے ہیں کہ اسکی رعایت میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوتی جیسے ضاد، ظاء اور ذال وغیرہ حروف کی ادائیگی صحیح مخرج سے عام طور پر مشکل سمجھی جاتی ہے۔ یہاں ایسی بات نہیں، تو کلمہ کی پہلی صفت اس کا سہل و خفیف ہوتا ہوا، آگے دوسری صفت حبیبتان الی الرحمن کی ہوئی کہ دونوں کلمے اللہ رحمان کے نزدیک محبوب و پسندیدہ ہیں۔ یہاں ایک بات یہ کہی جاتا ہے کہ جو لفظ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہوا اس کا استعمال مذکر و مونث دونوں کے لئے بغیر علامت تانیث کے ہوتا ہے، الرجل ثقیل والمراۃ ثقیل مستعمل ہے، اگر لفظ کلمتان کو صوری حیثیت سے مونث بھی مان لیا جائے تاہم اسکی صفت حبیب جو بمعنی محبوب ہے بغیر تاء تانیث کے حبیبان آنی چاہیئے، مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ اصول لازمی نہیں محض اختیاری ہے آپ جیسے المراۃ ثقیل کہتے ہیں، المراۃ ثقیلتہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلئے کلمتان کی صفت حبیبتان بھی آسکتی ہے۔

بہر حال! یہ دو کلمے جو زبان پر ہلکے اور اللہ کے یہاں محبوب ہیں، اسکی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن میزان عدل میں نہایت وزندار اور بھاری ہوں گے --- یہ کلمتان موصوف اپنی تین صفتوں کے ساتھ ملکر بقاعدہ نحو خبر مقدم ہیں اور مبتداء موخر "سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم" ہے آپ نے فن بلاغت میں پڑھا ہوگا کہ جب کبھی خبر میں طول اور ندرت ہوتی ہے تو مخاطب و سامع کے ذہن میں شوق اور مبتدا کی اہمیت اور اسکی طلب کے جذبہ کو قوی کرنے کے لئے خبر کو مقدم کر دیا جاتا ہے تاکہ اس شوق و طلب کی حالت میں جب مبتدا کا علم ہوگا تو وہ دل و دماغ میں گھر کر جائے گا اور اسکی اہمیت و قدر محسوس ہوگی، یہاں اسی نکتہ کی بنا پر خبر کی تقدیم اور مبتدا کی تاخیر ہوئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دونوں کلمے کون کون سے ہوئے تو بعض حضرات تو یوں کہتے ہیں کہ ایک کلمہ "سبحان اللہ و بحمدہ" دوسرا "سبحان اللہ العظیم" ہے۔ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حرف فاصل جو مغائرت پر دلالت کرے موجود نہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ دراصل حرف عطف واؤ یہاں محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے سبحان اللہ و بحمدہ و سبحان اللہ العظیم، مگر کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ پہلا کلمہ سبحان اللہ ہے اور دوسرا کلمہ الحمد اللہ ہے، جو "و بحمدہ" کی شکل میں مذکور ہے واؤ حالیہ ہے اور باء مصاحبت کے معنی میں ہے مطلب یہ ہوا کہ جو دو کلمہ جو عند اللہ محبوب زبان پر ہلکے اور میزان عدل میں وزندار ہیں، وہ سبحان اللہ ہے، درانحالیکہ یہ سبحان اللہ، اللہ کی حمد کے ساتھ ساتھ ہو یعنی الحمد اللہ کے ساتھ کہے جائیں اور اس مفہوم کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ سبحان اللہ والحمد للہ تملان مابین السموت والارض اور اس تقدیر پر رسول اللہ کے کلام کا اختتامیہ سبحان اللہ العظیم قرار پائیگا، علماء نے اس لفظ کے ذریعہ ختم کلام کے نکتوں میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ سبحان اللہ اور الحمد اللہ، حبیبتان الی الرحمن اور

رحمان اللہ کی ایک ایسی صفت ہے جو انسانوں کے اندر توقع و امید کی نفسیات پیدا کرتا ہے، حالانکہ الایمان بین الخوف والرجاء۔ یعنی اصل ایمان یہی ہے کہ اللہ کی رحمت کی توقع کے ساتھ اس کے جلال سے خوفزدہ بھی رہا جائے، تو یہاں اللہ کی صفت رحمت کو دیکھکر اور سبحان اللہ والحمد للہ کے میزان عدل میں وزن دار ہونے کو سنکر کہیں کسی کے دل میں محض امید ہی امید نہ قائم ہو جائے، اسلئے اعتدال پیدا کرنے کے لئے رسول اللہ نے آگے "سبحان اللہ العظیم" کہدیا۔ اس میں اللہ کی ایک صفت عظمت کا بیان ہے اور عظمت، جلال و استغنا کی نشانی ہوتی ہے، اسطرح مسلمانوں کے دل میں خوف کی نفسیات بھی پیدا ہو جائیگی اور وہ دیگر اعمال ضروریہ کی بجاآوری میں کسی سستی سے کام نہیں لیگا واللہ اعلم بالصواب

یہاں سبحان اللہ و بحمدہ کی ترکیب و تقدیر عبارت اور واؤ کے حالیہ یا عاطفہ پھر باء کے للمصاحبت یا للتعلیل یا للاستعانت وغیرہ کے تعلق سے بھی کچھ بحثیں کی جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ان دونوں کلموں کی معنی کے اعتبار سے مختلف حیثیتیں پیدا ہوتی ہیں، ان تفصیلات میں جانا نہ ضروری ہے اور نہ مفید، ساری تفصیلات و توجیہات کا قدر مشترک بس اتنا نکلتا ہے کہ اللہ کی ذات سارے عیوب و نقائص سے منزہ و مقدس ہے، بس ایک مسلمان پر لازم ہے کہ ہمیشہ سبحان اللہ کہتا ہوا ان کی تقدیس کرتا رہے، اور چونکہ اللہ تعالی تمام ہی صفات کمالیہ کے جامع اور پوری کائنات کے منعم حقیقی ہیں، اسلئے ہم سبھوں کا فریضہ ہے کہ الحمد للہ کہتے ہوئے ان کے حمد و شکر کا وظیفہ ورد زبان رکھیں اللہ ہم سبھوں کو اسکی توفیق و ہمت بخشے۔

اور پھر قبول کرتے ہوئے ان کے ثمرات سے نوازیں وما ذالک علی اللہ بعزیز

خاتمہ کلام

ہم سے جو کچھ بن پڑا وہ حاضرین کے مذاق اور آپ لوگوں کی حیثیت کی رعایت کرتے ہوئے اہم اور ضروری اشارات کی شکل میں عرض کر دیا، اب اس سے زیادہ وقت کچھ اور کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بحمد اللہ ختم بخاری کے وقت جو اجازت روایت کا معمول مشائخ کے یہاں جاری ہے۔ اس فریضہ سے ہم اور آپ اس سے پہلے ہی فارغ ہو چکے ہیں، ہماری سند حدیث کن مشائخ سے کتنے واسطوں کے ساتھ امام بخاری علیہ الرحم تک پہونچتی ہے وہ بتلا چکا ہوں اور جن شرطوں کے ساتھ ہمیں اپنے مشائخ سے اجازت روایت ملی تھی، ان شرطوں کیساتھ آپ سبھی حضرات کو اجازت بھی دے چکا ہوں، اس لئے اب دعا کریں کہ اللہ سبھوں کو حدیث رسول کی عظمت کے احساس کے ساتھ اسی کسوٹی پر ہمیشہ اپنے اقوال و اعمال کو کستے رہنے کی توفیق بخشے اپنی مرضیات کا پابند بنائے اپنے رسول اور دین اسلام کی محبت ہمارے دل میں بڑھاتا رہے اور دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بیوٹی آپریشن کا شرعی حکم

مولانا بدر الحسن قاسمی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھے سانچے میں ڈھالا ہے اس میں عقلی اور روحانی کمالات رکھنے کے ساتھ اسکی ظاہری شکل و صورت بھی اچھی بنائی ہے، اور دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اسے خوبصورت اور خوش اندام بنایا ہے، ساتھ ہی اسمیں خوب سے خوب ترکی جستجو اور زیبائش و آرائش کا جذبہ بھی رکھا ہے ۔۔۔ ارشاد ربانی ہے "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" ہم نے انسان کو اچھے سانچے پر پیدا کیا ہے (التین ۴)

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ "یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین"۔ اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو (الاعراف ۳۱)

نیز یہ بھی ارشاد ہے:

"قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق"۔ (۱) آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کی ہیں وہ زینتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں ممنوع کر دی ہیں؟

مردوں کے مقابلہ میں عورتیں چونکہ اپنی فطری ساخت، مقصد تخلیق، اور اپنے میدان عمل کے لحاظ سے زیب و زینت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ اسلئے شریعت نے ان کے لئے آرائش اور زینت کا میدان بھی وسیع رکھا ہے، زینت کے وہ اسباب جو مردوں کے لئے حرام کئے گئے ہیں عورتوں کے لئے انہیں بھی حلال اور مباح رکھا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"حرم لباس الحریر والذھب علی ذکور امتی واحل لاناثھم"۔ ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں کیلئے حرام کیا گیا ہے اور عورتوں کے لئے حلال کیا گیا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اس نے آخرت کے مقابلہ میں اس دنیوی زندگی کی بے ثباتی کو واضح کرنے، اور عبادت و ریاضت کی تلقین کرنے کے باوجود کائنات میں بکھرے ہوئی حسن و جمال اور مظاہر کائنات کی ظاہری خوبیوں سے منہ پھیر کر گوشہ گیر ہو جانے اور رہبانیت اختیار کر لینے کا حکم نہیں دیا۔

بلکہ کائنات میں پائے جانے والے حسن و جمال اور قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں ہم آہنگی اور توازن کو خدا کی نشانیوں میں شمار کیا ہے اور ان میں غور و فکر کرکے خدا تک رسائی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ ستاروں سے بھرا ہوا آسمان، لالہ و گل سے سجی ہوئی زمین، دامن دل کو کھینچنے والے پہاڑوں، دریاؤں، اور قدرتی آبشاروں کے منظر، رنگ برنگ کے خشکی اور سمندروں کی تہوں میں پائے جانے والی خداوند قدوس کی ان گنت ذی روح مخلوقات یہ سب کس لئے ہیں؟ اور کس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں؟

دوسری طرف دیکھئے تو آخرت میں ملنے والی جس جنت کو انسان کی آخری اور دائمی فرودگاہ بنایا گیا ہے، وہاں کے لئے بھی ایسی نعمتیں رکھی گئی ہیں جو دل کو نور اور نگاہوں کو سرور بخشنے والی ہیں اور یہ بشارت تک دی گئی ہے کہ:

فیھا مالا عین راٗت ولا اذن سمعت۔ ولا خطر علی قلب بشر۔

ان میں وہ چیزیں ہونگی جنکو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گذرا۔

یعنی جمال اور آرائش کا ایسا لا محدود سماں ہوگا جہاں تک کسی کے خیال کی پرواز بھی نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ ان کے حصول کے لئے انسان کو جتن بھی اسی طرح کرنا چاہئے تاکہ وہ ابدی قرار و سکون حاصل کر سکے۔

اسلام نے اس دنیا میں زیب و زینت اختیار کرنے کو جائز قرار دینے کے ساتھ اپنی دوسری تعلیمات کی طرح اسمیں بھی اعتدال کی راہ اپنانے کی تلقین کی ہے اور فریب پر مبنی ایسی آرائش سے منع کیا ہے جو بناوٹی ہو، جس سے دوسروں کو دھوکہ ہوتا ہو یا خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی لازم آتی ہو۔

چنانچہ جسم کو گودانا، ابرو کو باریک کرنا، دانتوں کے درمیان فاصلہ کو گھس کر بڑھانا، یا اپنے بالوں میں کسی اور کا بال ملا کر اسے زیادہ لمبا یا گھنا ظاہر کرنا یہ سب شرعاً منع ہے اور اس سے مکمل طور پر اجتناب کا حکم دیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے ایسا کرنے اور کرانے والوں پہ کھلے لفظوں میں لعنت بھیجی ہے، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ و سلم سے ایسے بہت سے ارشادات منقول ہیں جن میں صراحت کے ساتھ اوپر ذکر شدہ باتوں سے منع فرمایا گیا۔

سر کا منڈا لینا بھی عورتوں کیلئے ناجائز ہے، چنانچہ حج اور عمرہ میں مردوں کیلئے سر کا حلق کرانا (منڈانا) بہتر ہے جبکہ عورتوں کیلئے صرف بالوں کی تھوڑی سی مقدار قینچی سے کاٹ لینے کو کافی قرار دیا گیا ہے۔ اور سر کے بالوں کو مکمل طور پہ منڈا لینے یا تراش کر ختم کرلنے کی اجازت نہیں دی گی ہے

ترمذی شریف کی روایت ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم نہی ان تحلق المرأۃ رأسہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے اس سے منع فرمایا کہ عورت اپنے سر کے بال منڈائے۔

اس معاملہ میں اگر اجازت ہے تو اس بات کی کہ کسی مرض یا زخم کی وجہ سے سر کے بالوں کا منڈا لینا اگر ناگزیر ہو تو ضرورت کے مطابق ایسا کیا جا سکتا ہے اور شفایابی کے بعد پھر حسب سابق بالوں کا چھوڑنا ضروری ہوگا۔

مردوں کو شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ قینچی سے بال تراشنے یا استرے سے منڈانے میں یکسانی ہونی چاہئے سر کے کچھ حصہ کا مونڈ لینا اور باقی کا چھوڑ دینا "قزع" کہلاتا ہے جو بد ذوقی کی علامت ہے اور مثلہ کے مرادف ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رض کا ارشاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے "قزع" سے منع فرمایا ہے، دریافت کیا گیا ہے کہ قزع کیا چیز ہے تو انہوں نے کہا کہ بچہ کے سر کے بال کو کہیں سے مونڈا جائے اور کہیں سے چھوڑ دیا جائے تو یہ قزع کہلاتا ہے۔

اس وقت بعض قوموں میں "چوٹی" رکھنے کا جو رواج ہے کہ سر کے بیچ میں بال کی ایک لٹ چھوڑ دی جاتی ہے یا جس طرح ہپیوں یا بعض افریقی قبائل میں چھوڑ چھوڑ کر بال کو مونڈانے کا رواج ہے، اسے قزع کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے، جو بدنمائی کا ذریعہ اور طبیعت کی سلامتی کے منافی ہے۔

بعض حدیثوں اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ طبعی عمر کو پہونچ جانے کے بعد سر میں یا داڑھی میں جو سفید بال نظر آئیں ان کو نوچ دیا جاتے، البتہ اسکی اجازت ہے کہ مہندی وغیرہ کا خضاب استعمال کر کے سفید بالوں کو سرخ کیا جاتے۔

ابرو کے بال نوچ کر یا تراش کر باریک کرنے کی اجازت نہیں ہے، خلاصہ یہ کہ چہرے اور سر کے بالوں کے بارے میں شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ:

(۱)---کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو دھوکہ دہی اور فریب کا باعث ہو۔

(۲)---ایسے طریقہ سے بھی اجتناب کیا جائے جس سے خدا کی تخلیق میں تبدیلی لازم آتی ہو۔

(۳)---بالوں کے ازالہ کے لئے کوئی ناپاک چیز استعمال نہ کی جائے۔

(۴)---تراش خراش سے لڑکی لڑکا نظر نہ آنے لگے اور نہ لڑکا لڑکی کے مشابہ بن جائے۔

(۵) اس عمل سے کسی بڑی مضرت کے پیش آنے کا اندیشہ نہ ہو۔

البتہ کسی بچہ کے بال اگر حادثہ یا بیماری کے نتیجہ میں سفید ہو گئے ہوں تو اسکا علاج کرایا جا سکتا ہے، اسی طرح اگر کسی بچہ یا عورت کے چہرے پہ ڈارھی نکل آئے تو اسکا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اسمیں کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔

جہاں تک جسم کو گودنے، اور پختہ رنگ کے ذریعہ اس پر نقش و نگار بنانے کا تعلق ہے، تو یہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے اس سے مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے ایسا کرنے والیوں اور کرانے والیوں سب پہ لعنت بھیجی ہے اور اس عمل سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے،

اسی طرح بعض معاشروں میں جوٹونے ٹوٹکے کے طور پر چہرے یا جسم پہ داغ کر نشان بنانے کا رواج ہے وہ بھی قطعی ناجائز ہے، اور شریعت نے اس سے بھی منع کیا ہے۔

البتہ چہرے پہ پھوڑے، پھنسی یا داغ وغیرہ جو بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے ازالہ کیلئے مرہم وغیرہ کا استعمال شرعاً جائز ہے، لیکن ایسی تدبیر کرنا جس سے چہرے کی کھال بدل جائے اور جلد مسخ ہو کر رہ جائے، درست نہیں ہوگی۔

خدا نے انسان کے جسم کے جس عضو کو جس حالت میں پیدا کیا ہے اسکی مصنوعی طور پر تبدیلی جائز نہیں ہے البتہ اگر کوئی عضو کٹ گیا ہو یا مفلوج ہو گیا ہو تو اسکی جگہ پہ مصنوعی اعضا کے استعمال میں مضائقہ نہیں ہے، مثال کے طور پہ جس شخص کے دانت ٹوٹ گئے ہوں یا ناک کٹ گئی ہو اسکے لئے اسکی اجازت ہے کہ کسی دھات (خواہ سونا ہی کیوں نہ ہو) کے بنے ہوئے مصنوعی دانت استعمال کرے۔

اسی طرح کسی شخص کے ہاتھ میں اگر پانچ کے بجائے چھ ۶ انگلیاں نکل آئیں اور زائد انگلی اس کے لئے تکلیف کا باعث ہو تو آپریشن کے ذریعہ اس کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

لڑکیوں کے کان اس مقصد کے لئے چھیدنا کہ اسمیں بالیاں ڈالی جا سکیں، اسکی فقہاء احناف اور حنابلہ نے اجازت دی ہے البتہ امام غزالی اور بعض دوسرے شافعی فقہاء نے اس سے بھی منع کیا ہے

لیکن صحیح موقف دلائل کی روشنی میں وہی ہے جو عام فقہاء نے اختیار کیا ہے، اور اسکے جواز کا فتویٰ دیا ہے، کیوں کہ خود صحابہ رض کے زمانہ میں کان کی بالیوں کے پہننے کا رواج تھا اور حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

موجودہ زمانہ میں تجمیل (بیوٹی) کے لئے نئے نئے طریقوں کا رواج ہو گیا ہے اور حسن و جمال کی حفاظت یا اسمیں اضافہ کے نام پر طرح طرح کی حیاسوز حرکتیں سامنے آنے لگی ہیں ظاہر ہے کہ عورت کے لئے سب سے قیمتی زیور اسکی عفت و عصمت ہے اور حیا اسلامی اخلاقیات کا بنیادی عنصر ہے، اس لئے جو چیز اس دائرہ سے خارج ہو ان کے ناجائز ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے اور نہ وہ چیزیں اس گفتگو کا موضوع ہیں۔

اس وقت بحث صرف ان صورتوں سے ہے جو ڈاکٹروں اور سرجری کے ماہرین کے ذریعہ تکمیل پاتی ہیں اور جنہیں جراحت تجمیل (بیوٹی آپریشن) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ فلمی دنیا میں کام کرنے والی عورتیں، سربراہان مملکت، اور ٹیلی ویژن اسکرین پہ نمایاں ہونے والی عورتوں کا اپنی ناک، چہرے کی کھال، سر اور چہرے کی مجموعی ہیئت میں آپریشن کے ذریعہ ایسی تبدیلی کرانا جس سے اس کی ہیئت بدل جاتی ہو شرعاً

جائز نہیں اس میں فریب اور خدا کی تخلیق میں تبدیلی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔
اسی طرح چہرے میں پڑجانے والی جھریوں کو مٹانے اور آپریشن کے ذریعہ کھال کو اس طریقہ پر باندھنے کا عمل جس سے عمر زیادہ معلوم نہ ہو یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے، البتہ دوا یا کریم وغیرہ کے ذریعہ کھالوں میں تازگی بحال کرنا، اسی طرح کسی کم عمر بچی کے چہرہ پہ اگر بیماری کی وجہ سے جھریاں نمایاں ہوگئی ہوں، جس سے اسکی ہیئت بگڑ گئی ہو تو دوا یا آپریشن کے ذریعہ اسکی طبعی حالت بحال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
تیسرا عمل وہ ہے جو جسمانی ورزش اور ریجیم کے دائرہ میں آتا ہے، مثال کے طور پر موٹاپے کو کم کرنے کے لئے ایسی تدبیر کرنا جس سے زائد چربی ختم ہوجائے، اسمیں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ موٹاپا اگر تکلیف دہ ہوگیا ہو جس سے آدمی کے لئے اپنے فرائض کی ادائیگی میں دشواری پیش آتی ہو تو ایسی صورت میں شریعت کی تعلیمات کا تقاضہ یہی ہوگا کہ آدمی ورزش کے ذریعہ یا کھانے پینے میں باقاعدگی پیدا کرکے اپنے جسم کا وزن کم کرلے تاکہ وہ اپنے آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ رکھ سکے جو موٹاپے کے وجہ سے پیدا ہوا کرتی ہیں، اور اپنے دینی و دنیوی فرائض صحیح طریقے سے انجام دے سکے۔
اسی طرح اگر کوئی عورت حد سے زیادہ لاغر ہو جسکی وجہ سے تپ دق میں مبتلا نظر آتی ہو اس کے لئے بھی شرعاً اسکی اجازت ہے کہ ایسی جائز تدبیر اختیار کرے جس سے اسکا لاغرپن دور ہوجائے۔
فقہاء کی تصریحات میں اسکی متعدد نظیریں ملتی ہیں، مثال کے طور پر، فقہ حنفی کی کتاب فتاوی قاضیخان میں ہے کہ:
امرأہ تاکل الفتیت و اشباہ ذلک لاجل السمن قال ابو مطیع البلخی لاباس بہ مالم تاکل فوق الشبع

بعض عورتیں موٹاپے کے لئے کچھ خاص قسم کی غذائیں استعمال کرتی ہیں اس کے بارے میں فقیہ ابو مطیع بلخی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ شکم سیری کی مقدار سے زیادہ نہ کھائی جائے۔

اسی طرح یہ بھی مذکور ہے
یجوز الحقنہ للتداوی للمرأہ وغیرھا وکذا الحقنہ لاجل الھزال لان الھزال اذا فحش یؤدی الی السل

"مرض کے لئے عورت کو حقنہ لگانا جائز ہے۔ اسی طرح دبلاپن (لاغری) کو ختم کرنے کے لئے بھی، کیونکہ لاغری اگر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو تپ دق کا باعث بن جایا کرتی ہے۔"

فتاوی عالمگیری میں ہے کہ
سئل ابو مطیع عن امرأۃ تاکل القبقبہ و اشباہ ذلک للسمن۔ قال لاباس بہ مالم تاکل فوق الشبع (۳۵۵\۵)

"فقیہ ابو مطیع سے دریافت کیا گیا کہ بعض عورتیں موٹا ہونے کے لئے کچھ مخصوص قسم کی خوراک استعمال کیا کرتی ہیں اس کا شرعی حکم کیا ہے، تو انہوں نے کہا کہ اگر معقول مقدار میں کھائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ شکم سیری سے زیدہ مقدار نہیں ہونی چاہئیے

نیز صراحت کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ

والمراہ اذا کانت تسمن نفسھا لزوجھا فلا بأس بہ (۵\۳۵۶)

عورت اگر اپنے شوہر کی خاطر اپنے موٹاپے میں اضافہ کی تدبیر کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

کھلی ہوی بات ہے کہ ان فقہاء کے زمانہ میں جو شکلیں رائج تھیں انہوں نے ان کا حکم ذکر کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ورزش کے طریقوں میں تنوع پیدا ہونے کے ساتھ طب اور سرجری نے بھی غیر معمولی ترقی کرلی ہے، لہذا نئی پیدا شدہ شکلوں کا حکم شرعی بنیادی اصولوں اور فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

****

پیغمبرِ اسلامؐ اور علماءِ اہلِ کتاب

خالد سیف اللہ رحمانی

مغربی اہل علم نے پیغمبر اسلام کی نبوت سے انکار کے لئے بڑی ناکام کوششیں کی ہیں اور اس کے لئے علم واستدلال کے ہتھیار بھی بار بار بدلے ہیں کبھی آپ کی تعلیمات کو حالات کے تحت اندر سے اٹھنے والا رد عمل قرار دیا، کبھی مرض و بیماری کا نتیجہ قرار دیا اور کبھی اہل کتاب اور بالخصوص سفر شام اور اس سفر میں راہبوں سے ملاقات اور تاثر کا ثمرہ اور چونکہ یہ آخری صورت ان کو نسبتاً زیادہ قرین قیاس محسوس ہوئی۔ اس لئے عموماً ان حضرات نے اسکو ایک ناقابل تردید علمی تحقیق کا رنگ دے کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

وہ مستشرق علماء بھی جو اسلام کے بارے میں ایک حد تک منصف مزاج مانے جاتے ہیں آپ کی تعلیمات کو اہل کتاب علماء سے تاثر کا نتیجہ قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً ڈاکٹر ڈریپر ان علماء میں ہیں جن کو معتدل اور اسلام کے بارے میں مہذب اور انصاف پسند سمجھا جاتا ہے لیکن وہ بھی اسلام کو عیسائیت کا "نسطوری فرقہ" قرار دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں۔

بحیرہ راہب نے بصرا کی خانقاہ میں حضرت محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم کی اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک حرف بہ حرف کہہ سنائی۔ یہ انہی ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے دل میں کلیسائے مشرق کی بت پرستانہ رسموں کی طرف سے عموماً اور اوثان و اصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی، جس کو کوئی قوت مٹا نہ سکی۔ اور بحیرہ راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ مسیح ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا۔ آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن مستعد اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ وہ اتالیق تھے۔ جنہیں ارسطو کے جانشین اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ

نسطوریوں کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔ چنانچہ اس ارادت و محبت کا جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے۔ آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت اس انس و عقیدت کا کیا ہوگا کہ آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقائد کی توسیع و اشاعت کے لئے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی مشائی اصول اختیار کر لئے اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جب حضرت محمد سن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے اور بھی سفر کئے یہ خیال کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ان موقعوں پر آپ نسطوری خانقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز مکینوں سے جنہیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا، ضرور ملے ہوں گے۔ (۱)

بحیرہ راہب سے ملاقات

ان راہبوں سے ملاقات کے واقعات کو کس طرح رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے اسکا اندازہ اصل واقعہ سے ہوگا۔ سیرت کی اکثر کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے بعد حضرت ابوطالب نے شام کا تجارتی سفر فرمایا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و سلم کے اصرار پر باوجود کم عمری کے حضرت ابوطالب نے آپ کو ساتھ لے لیا اس وقت آپ کی عمر کیا تھی اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ کچھ لوگوں نے سات سال کہا ہے۔ (۲) بعض روایات میں عمر مبارک بارہ سال ذکر کی گئی ہے۔ یہی رائے طبری کی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اس وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی سہیلی نے اسی کو ترجیح دیا ہے اور یہی طبری نے ابن شہام سے نقل کیا ہے۔ (۳)

صحاح ستہ میں اس واقعہ کو صرف امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ترمذی کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قافلہ قریش کے ساتھ شام گئے، راستہ میں ایک راہب کی خانقاہ (صومعہ) ملی ان حضرات نے اسی خانقاہ کے قریب رخت سفر کھولا یہ راہب جو اس سے پہلے کبھی قافلہ عرب کے خیر مقدم کے لئے نہیں نکلا تھا۔ خلاف توقع ان حضرات کے پاس آیا اور رسول اللہ کا ہاتھ تھام لیا اور گویا ہوا! "یہ تمام عالم کے سردار اور پروردگار عالم کے رسول ہیں۔ خدا نے ان کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" شیوخ قریش نے دریافت کیا کہ تمہیں یہ کیوں کر معلوم ہوا اس نے کہا میں نے تمام شجر و حجر کو آپ کو سجدہ کرتے ہوئے پایا اور یہ دونوں کسی نبی ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ نیز میں نے آپ کے مونڈھے پر ختم نبوت دیکھی ہے۔

راہب اتنی گفتگو کے بعد لوٹ گیا اور ان حضرات کی ضیافت کی تیاری کرنے لگا۔ چنانچہ لوگ کھانے پر آگئے اور آپ کو اونٹنیوں میں چھوڑ دیا، راہب نے آپ کو بلوایا۔ آپ تشریف لائے تو اس طرح کہ ایک بادل آپ پر سایہ فگن تھا۔ درخت کی سایہ دار جگہ لوگوں نے پہلے ہی سے سنبھال رکھی تھی۔ آپ نے بے سایہ جگہ پر تشریف رکھا لیکن ہوا یہ کہ درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک آیا۔ چنانچہ راہب نے حضرت ابوطالب کو سمجھایا کہ آپ کا ان کو روم لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اہل روم ان کو پہچان لیں گے اور ان کو قتل کر دیں گے یہاں تک کہ حضرت ابوطالب نے آپ کو واپس کر دیا۔ حضرت بلال کو حضرت ابوبکر نے آپ کے ساتھ کر دیا۔ نیز خود راہب نے کچھ سامان سفر بھی ساتھ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ (۴)

اس روایت کی تشریح میں اہل سیر کے درمیان کئی نکات پر اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت ابوطالب آپ کو شام لے گئے اور اپنے ساتھ ہی واپس لائے۔ (۵) طبقات ابن سعد کی روایت میں صرف آپ کی بحیرا راہب سے ملاقات کا ذکر ہے۔ (۶) خود بحیرا راہب کے بارے میں بعض اہل سیرت کہتے ہیں کہ وہ ایک یہودی عالم تھا (۷) اور اکثر اہل سیرت کی رائے ہے کہ وہ ایک عیسائی عالم تھے اور اس خانقاہ میں عیسائی کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا (۸) اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ بحیرا کہاں سکونت پذیر تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ مقام کفو کا اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ سرزمین شام کے ایک گاؤں بلقاء میں واضح ہو کہ کفو بصریٰ سے چھ میل کی دوری پر ہے (۹) یہ بات بھی بعض روایت میں آئی ہے کہ کچھ اہل روم اسی وقت آپ کی تلاش میں اس خانقاہ کو پہنچ گئے لیکن راہب کے سمجھانے پر وہ لوگ آپ پر کسی تعدی سے باز رہے اور ان لوگوں نے بیعت کر لی۔ یہ بات مبہم ہے کہ انہوں نے کس سے بیعت کی۔؟ راہب سے یا آپ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو امن دینے پر راہب سے بیعت کی ہوگی (۱۰) اسی طرح کے بعض اور اختلافات اور تضادات اس واقعہ کی روایت میں موجود ہیں۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقت حال کو سمجھنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئے۔ اول یہ کہ خود یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے کس درجہ مستند اور قابل اعتبار ہے۔ دوسرے پیغمبر اسلام کی مذکورہ راہب کے ساتھ یہ ملاقات کتنے وقت کی تھی اور کیا آپ کی عمر اس بات کی متحمل تھی کہ آپ مذہب کے مابعد الطبیعی تصورات اور فلسفہ الٰہیات کو سمجھ سکیں۔؟

روایات پر ایک ناقدانہ نظر

اس واقعہ میں متعدد ایسی باتیں موجود ہیں جو اس روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ امام ذہبی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ مجھے اس کے موضوع یعنی

من گھڑت ہونے کا خیال ہوتا ہے (۱۱) مثلا حضرت ابوبکر رسول اللہ سے دو سال چھوٹے تھے اس طرح اس واقعہ کے وقت ان کی عمر سات سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال قرار پاتی ہے یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ اتنے طویل سفر پر اور وہ بھی حفاظتی اقدام کے تحت ابوطالب نے آپ سے بھی کم عمر لڑکے کے ساتھ بھیجا ہو۔ نیز حضرت بلال کا آپ کے ساتھ آنا تو اور بھی عجوبہ ہے اس لئے کہ اس واقعہ کے تیس سال کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت بلال کو امیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کیا۔ اس لئے اس سفر میں حضرت بلال کی حضرت ابوبکر کے ساتھ رفاقت اور حضرت ابوبکر کا حضرت بلال کو بھیجنا ناقابل قیاس ہے۔ اسی لئے ابن سید الناس نے لکھا ہے کہ سند کے صحیح ہونے کے باوجود اس روایت کا متن قابل اعتماد نہیں۔ (۱۲)

علامہ ابن کثیر نے بھی لکھا ہے کہ علاوہ حضرت ابوبکر اور حضرت بلال کے ساتھ آپ کی واپسی کے ناقابل قیاس ہونے کے ایک خامی اس میں یہ بھی ہے کہ بادل کے آپ پر سایہ فگن ہونے کا جوذکر اس روایت میں ہے۔ وہ دوسری صحیح روایات میں موجود نہیں۔ نیز یہ حدیث حضرت ابو موسی اشعری کی مرسل ہے اور حضرت ابو موسی سنہ ۷ھ میں مدینہ تشریف لائے ہیں۔ اس طرح جس راوی نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے وہ خود اس کا چشم دید نہیں ہے۔ (۱۳) جہاں تک اس روایت کے مرسل ہونے کی بات ہے جس پر علامہ شبلی نے بھی کلام کیا ہے تو یہ کوئی قوی وجہ ضعف نہیں کیوں کہ صحابہ کی مرسل روایات بالاتفاق معتبر ہے۔ لیکن روایت سے مضمون میں مختلف نکات میں راویوں کا اختلاف و اضطراب بعض ناقابل قیاس امور کا ذکر خود آپ سے اس واقعہ کا منقول نہ ہونا، محمد بن اسحاق اور واقدی جیسے متکلم فیہ راویوں سے اس واقعہ کا مروی ہونا اور اس بات کا احتمال پایا جانا کہ شاید اس واقعہ کی سند کسی غیر مسلم راوی پر منتہی ہوتی ہو۔ راہب کا کہنا کہ شجر و حجر سجدہ کر رہے تھے اور رفقاء سفر کا اس کو محسوس نہ کر پانا یہ مختلف باتیں ہیں جو اس روایت کی صحت کو مشکوک کر دیتی ہیں۔

اس ملاقات کا عرصہ

کتب سیرت میں جتنی روایات اس واقعہ کی بابت ہیں وہ سب اس امر پر شاہد ہیں کہ بحیرہ راہب سے آپ کی ملاقات ایک پہر سے زیادہ کی نہ تھی۔ ایک وقت راہب مذکور نے قافلہ کی ضیافت کی۔ قافلہ کی آمد اور کھانے کے وقت بارہ راہب کی آپ سے اور اہل قافلہ سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا خلاصہ محض اتنا تھا کہ فضل خداوندی سے آپ کو نبوت ملنے والی ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا آپ کی عمر اس وقت بارہ سال اور زیادہ صحیح روایت کے مطابق صرف نو سال کی تھی۔ اتنی کم عمر میں کسی غامض فکر و تصور اور اعلی دینی اور اخلاقی تعلیمات نیز تاریخی قصص و

واقعات کی حفاظت ناقابل تصور ہے۔ اس لئے کوئی بھی معقول اور منصف مزاج شخص اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتا کہ اتنے کم وقت کی مختصر ملاقات اور کمسنی کے ساتھ آپ نے بحیرہ راہب سے ایسا مذہبی اور علمی استفادہ کیا ہو گا کہ انہیں تعلیمات پر آپ اپنی نبوت کی بنیاد رکھیں۔

نسطورا سے ملاقات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا سفر شام اس وقت ہوا جبکہ عمر مبارک پچیس سال تھی (۱۴) یہ سفر آپ نے حضرت خدیجہ کی خواہش پر اور انہی کا مال لے کر تجارت کی غرض سے کیا تھا۔ اس سفر میں حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ بھی آپکے ساتھ تھا اس موقع سے بحیرہ نامی راہب سے آپ کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ روایت میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس راہب کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ایک درخت کے نیچے بیٹھے۔ راہب نے آپ کی اس نشست سے اندازہ کیا کہ آپ نبی ہیں اس لئے کہ بقول اس کے اس درخت کے نیچے ہمیشہ انبیاء ہی بیٹھا کئے ہیں۔ "مانزل تحت هذه الشجرة قط الا نبی" (۱۵) ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میسرہ نے اس سفر میں دو فرشتوں کو بھی دیکھا جو آپ پر سایہ فگن رہتے تھے اور دھوپ سے آپ کو بچایا کرتے تھے۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ ان فرشتوں کا مشاہدہ خود اس راہب نے کیا تھا۔ (۱۶) تاہم اس موقع سے اہل سیر صرف اسی قدر صراحت کرتے ہیں کہ راہب نے میسرہ کو بتایا کہ آپ کو نبی ہونا چاہئے۔ نیز اس نے میسرہ سے پوچھا کیا آپ کی آنکھ میں سرخی بھی رہتی ہے۔؟ میسرہ نے کہا ہاں آپ کی آنکھ ہمیشہ سرخ رہتی ہے۔ "نعم لاتفارقہ" (۱۷) سیرت کی کسی کتاب میں اس موقع سے آپ کے اور بحیرہ کے درمیان گفتگو اور تبادلہ خیال کا ذکر نہیں۔

روایت کی فنی حیثیت

علاوہ اس بات کے کہ اسکی سند میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جن کا مقبول ہونا محدثین اور علماء و رجال کے نزدیک متفق علیہ نہیں۔ اس کے مضمون میں بھی بعض ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جو اس روایت کی صحت کو مشکوک کر دیتی ہیں مثلاً یہ کہنا کہ یہ ایسا درخت ہے جس کے نیچے نبی ہی بیٹھا کئے ہیں۔ دو ایسی باتوں کو شامل ہے جو عادۃً ناممکنات میں سے ہیں ایک یہ کہ اس درخت کی عمر اتنی طویل رہی ہو کہ کم سے کم حضرت مسیح سے لے کر آپ کے زمانہ تک وہ قائم رہا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس صحرائی علاقہ میں جہاں کہ سایہ دار جگہ کی بڑی کمی ہوتی ہے۔ کوئی راہگیر اس درخت کے نیچے بیٹھا ہی نہ ہو، ابن ہشام کے شارح سہیلی نے گو اس مسئلہ میں تاویل و توجیہ کی راہ اختیار کی ہے۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو بھی مضمون حدیث میں

اس سقم کا احساس ہے ۔ (۱۸)

دوسرے نسطورا اور بحیرہ راہبوں سے ملاقات کی دونوں روایتوں سے جو مکمل تصویر ابھر کر آتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ ان راہبوں کی پیشنگوئی کی وجہ سے خود آپ اور عرب کے متعدد شیوخ ورؤسا اور تجار بھی مستقبل میں آپ کے نبی بنائے جانے سے واقف ہو چکے تھے ۔ میسرہ کے ذریعہ حضرت خدیجہ بھی اس سے آگاہ ہو چکی تھیں اور انہی بشارتوں اور برکات کو دیکھ کر انہوں نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا تھا یہ ایک ایسی غیر معمولی خبر تھی جو یقینا اس بات کی مقتضی ہے کہ اہل مکہ میں اس نے ایک تعجب انگیز اور معروف خبر کی حیثیت سے حاصل کر لی ہوتی اور وہ آپ کی نبوت کے لئے چشم براہ ہوتے لیکن سیرت کے واقعات اس کے عینی بر عکس ہیں ۔ آپ جب نبی بنائے جاتے ہیں تو خود آپ کے لئے ایک گھبرا دینے والی بات ہوتی ہے ۔ بلکہ خود اس پر تو قرآن ناطق ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے تک آپ کو اسکا کوئی تصور بھی نہ تھا کہ آپ اس منصب پر سرفراز ہونے والے ہیں ۔ (وما کنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب (القصص صفحہ ۸۶)

پھر جب آپ حضرت خدیجہ سے ماجرا سناتے ہیں تو آپ کو دلاسا ضرور دلاتی ہیں اور آپ کے اخلاق کریمانہ اور کمزوروں اور یتیموں کے ساتھ آپ کے سلوک پر روزانہ کا ذکر ضرور کرتی ہیں مگر اس مزدہ نبوت کو یاد نہیں کرتیں اور اپنے ایک بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں جو عیسائی عالم تھے ۔ ورقہ جو آپ کی نبوت کو سمجھ گئے آپ نبوت سے سرفرازی پر وہ انداز اختیار کرتے ہیں جو کسی غیر متوقع واقعہ کے پیش آنے پر ہو اہل مکہ کے سامنے آپ جب اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں تو ان کے لئے بھی ایک ناقابل یقین اور یکسر نامانوس خبر ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ حضرت ابوطالب جن کے ساتھ آپ نے سفر فرمایا تھا ان کو بھی راہب کا واقعہ یاد نہیں آتا اور وہ حالت کفر ہی میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں ۔ یہ پہلو اس روایت کے مضمون کی صحت کو کس درجہ مشکوک کر دیتا ہے وہ محتاج اظہار نہیں ۔ لیکن خود اس روایت میں بحیرہ راہب سے جس ملاقات کا ذکر ہے ۔ اس میں راہب اور پیغمبر اسلام کے درمیان کسی گفتگو کا ذکر نہیں ۔ نہ ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور میسرہ کا ایک دو دنوں بھی یہاں قیام رہا ہو ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع سے اس امر کی قطعا کوئی نشاندہی نہیں ہوتی کہ آپ کا اتنے وقت کے لئے اس خانقاہ کے پاس قیام رہا ہو کہ مذہبی موضوعات پر آپ نے ان سے تبادلہ خیال کیا ہو ۔

دوسرے قرائن

جن لوگوں نے نسطورا اور بحیرہ راہبوں سے پیغمبر اسلام کی نبوت کا رشتہ جوڑا ہے ۔ علاوہ ان حقائق کے جو اوپر مذکور ہوئے تین نکات خاص طور پر قابل غور ہیں ۔ اول یہ کہ پیغمبر اسلام کے دعوی نبوت اور ان اسفار کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے ۔ ؟ دوسرے جو شخص اتنا ذہین

ہو کہ وہ چند لمحات کی مختصر ملاقات کے ذریعہ اتنے بلند مذہبی افکار کی تخلیق کر سکتا ہو اس کو ضرور اس امر سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ وہ کیا تدریجی طریقہ اختیار کرے جس سے اس کے دعویٰ کو قبول عام حاصل ہو۔ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اسکی تصدیق ہوتی ہے ۔؟

تیسرے آپ کی تعلیمات اور ان راہبوں کی تعلیمات میں کس درجہ مماثلت ہے ۔؟ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ بحیرہ راہب سے آپ کی ملاقات ۱۲\ سال اور نسطورا سے ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی اس دوسرے سفر سے واپسی کے ساتھ ہی مکہ کی ایک سرمایہ دار اور شریف خاتون حضرت خدیجہ سے آپ کا نکاح ہوتا ہے ۔ اگر آپ کی تعلیمات ان راہبوں سے تاثر پر مبنی ہوتیں تو ضرور تھا کہ اس سفر سے واپسی کے ساتھ ہی آپ نے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی ہوتی اور حضرت خدیجہ سے ازدواجی رشتہ کی بنا پر آپ کو جو معاشی خوش حالی اور فراغ دستی حاصل تھی اس کا استعمال کرتے ہوئے آپ نے اپنی دعوت کو مقبول بنانے کی سعی کی ہوتی ان اسفار کے بعد ۲۸ اور ۱۵ سال تک مکمل خاموشی، مذہبی مسائل اور عقائد ورسوم پر سکوت اور اتنا عرصہ گذرنے اور ۴۰ سال عمر ہونے کے بعد اچانک دعوی نبوت اس بات کو غلط ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ان حضرات سے کوئی مذہبی اثر قبول کیا ہو، ان راہبوں کے مذہبی افکار و تصورات نے اگر آپ کے دل و دماغ پر اس درجہ گہری چھاپ ڈالی ہوتی تو فطری طور پر آپ بار بار ان سے ملاقات کی کوشش کرتے ۔ یا ان سے ملاقات کے متمنی اور آرزو مند ہوتے مگر آپ کی سیرت میں اسکا کوئی سراغ نہیں ملتا بلکہ آپ کبھی ان کے نام بھی اپنی زبان پر نہ لاتے ۔

آپ کا دعویٰ نبوت اگر نعوذ باللہ امر الٰہی کے بجائے داخلی انفعال کا نتیجہ ہوتا تو اس کے لئے آپ نے کمال ذہانت کے ساتھ ایک منصوبہ مرتب کیا ہوتا ۔ اس منصوبہ میں چند باتیں ضرور موجود ہوتیں ۔ اول یہ کہ آپ اپنے مشن کا آغاز کسی ایسی بات سے کرتے جو عربوں کے لئے قابل قبول ہوتیں ۔ اول یہ کہ آپ اپنے مشن کا آغاز کسی ایسی بات سے کرتے جو عربوں کے لئے قابل قبول ہوتیں اور نقطہ اشتراک کا درجہ رکھتیں ۔ مثلاً قریش یا عربوں کی قومیت کے احساس کو آپ پروان چڑھاتے ۔ یا کم سے کم عقیدہ کی بجائے اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے اور سماجی ناانصافی کے خاتمہ کی تحریک چلاتے، یہ وہ باتیں تھیں جو اختلاف اور ٹکراؤ کے بغیر اہل عرب کو بہ مقابلہ ایران و روم کے آپ کے زیر قیادت مجتمع کر سکتی تھیں ۔ مگر آپ نے ان سب کو چھوڑ کر اپنے دعوی نبوت کا آغاز عقیدہ توحید سے کیا جو ان کے صدیوں پرانے تصورات اور زندگی کے تمام اصولوں کی اساس پر ضرب کاری کا درجہ رکھتا تھا ۔ دوسرے آپ نے عام مصلحین کے انداز پر تدریج کی راہ

اختیار نہیں کی کہ آہستہ آہستہ قوم میں قبولیت کی صلاحیت پیدا کی جائے پھر ان کے سامنے اپنے مشن کا لب لباب رکھا جائے بلکہ آپ نے مکمل خاموشی کے بعد ان کو اپنے قدیم عقائد و تصورات سے مکمل بغاوت کی دعوت دی۔ تیسرے آپ کے دعویٰ نبوت کے بعد سال دو سال نہیں بلکہ پورے ۱۳ سال مکہ میں اس طرح گذرے کہ اسمیں ہر آنے والا دن پچھلے دن کے مقابلہ سخت ہوتا گیا اور آپ کے مشن کی کامیابی بظاہر موہوم ہوتی چلی گئی اگر آپ کے دعویٰ کی پشت پر زبردست اعتماد و یقین کی قوت اور ایمان کی کیفیت نہ ہوتی اور وہ محض کسی فکر مستعار یا روانا روا داخلی جذبات کا نتیجہ ہوتی، تو اس موقع پر آپ کا دو میں سے کوئی ایک رویہ ہونا چاہئے تھا یا تو ابتلائیں اور آزمائشیں اور اہل مکہ کی طرف سے مایوس کن ردعمل کی وجہ سے آپ اپنی تحریک کو ختم کر دیتے یا "لو، اور دو،" کی پالیسی اختیار کر کے اہل مکہ کے لئے اسلام کو قابل قبول بناتے جیسا کہ عیسائیوں نے یونانیوں میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لئے کیا۔ بلکہ یونان کو اپنے افکار دیئے کم اور ان کے عقائد و تصورات قبول کئے زیادہ۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح کی پیش کی ہوئی توحید کی جگہ سینٹ پال کی تثلیث نے لے لی۔ جو یونانیوں میں پہلے سے موجود عقیدہ تثلیث کی معمولی سے بدلی ہوئی شکل تھی۔

اہل مکہ کا سکوت

ان کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے عقیدہ نے اہل مکہ کے قلوب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو آگ لگا دی تھی وہ اس درجہ تیز اور شعلہ ریز تھی کہ یہ اسلام پر اعتراض کے لئے ایک لحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ اور قرآن کو کبھی شاعری کبھی معمولی قصہ کہانی اور کبھی سحر و جادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے اور چونکہ خود ان کے دل اس کے خلاف حقیقت ہونے پر مطمئن تھے۔ اس لئے بار بار ان کو اپنے اعتراضات اور اشکالات کا پیرھن تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ مکہ میں بعض یہودی اور عیسائی غلام موجود تھے۔ غالباً وہ لوگوں کو تورات وغیرہ کے بعض واقعات بھی کبھی کبھی سنایا کرتے تھے رازی قرطبی اور زمخشری نے اس سلسلہ میں تین غلاموں مویطب بن عبدالعزی کے غلام عداس، علاء بن حضرمی کے غلام یسار اور ابو فکیہہ رومی کا ذکر کیا ہے جو آپ کے دعوی نبوت کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی نسبت سے قبول اسلام کے بعد آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اہل مکہ میں سے نضر بن حارث نے اس واقعہ کو لے کر یہ پروپگنڈا بھی کرنے کی سعی کی کہ آپ انہیں اہل کتاب سے سیکھ کر قرآن مجید کی تصنیف فرماتے ہیں (۱۹) مگر یہ اعتراض اس درجہ غلط اور ناقابل قبول تھا

کہ خود اہل مکہ نے ان کو قبول نہیں کیا۔ اور لوگوں نے آپ کو ساحر و مجنون وغیرہ تو کہا اور مسحور بھی قرار دیا مگر اس اعتراض کو نہ دہرایا۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ کہ اعتراض کے ادنی گوشوں کے تجسس کے باوصف اہل مکہ کی بھی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ ان راہبوں سے ملاقات اور آپ کے اسفار شام کو اپنے اعتراض کی بنیاد بنا سکیں۔ اور قرآن کو ان کی تعلیمات کے تاثر کا نتیجہ قرار دے سکیں۔ غالبا وہ موجودہ زمانہ کے منصف مزاج مغربی علماء سے زیادہ حقیقت پسند تھے۔ اور اگر اس عہد کے مستشرقین نادانستہ اس طرح کے اعتراض کر رہے ہیں تو ان سے زیادہ اصحاب دانش بھی کہ وہ اس بات کا بخوبی شعور رکھتے تھے کہ کسی فکر کا اس درجہ گہرا اثر قبول کرنے کے بعد (جس نے کہ اس کو گردوپیش پھیلی ہوئی دنیا سے باغی بنا دیا ہو) پندرہ بیس سال کی طویل مدت اظہار خیال سے باز نہیں رہا جا سکتا۔

تعلیمات اسلام اور عیسائیت کا مطالعہ

اب میں تیسرے نکتہ کی طرف آتا ہوں۔ کوئی تحریک دوسری تحریک اور اس کے لٹریچر سے تاثر کے نتیجہ میں ابھری ہو تو چند باتیں ضروری ہیں۔ اول یہ کہ دونوں کے تصورات میں قابل لحاظ حد تک یکسانیت ہو۔ دوسرے واقعات کے بیان میں دونوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہو۔ تیسرے ایک لٹریچر جو دوسرے لٹریچر سے ماخوذ ہو۔ وہ پہلے لٹریچر کی تلخیص تو ہو سکتا ہے لیکن وہ اس کے بیان کئے ہوئے تاریخی حقائق میں اضافہ نہیں کر سکتا۔

اب غور کرو کہ عیسائیت اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں کسقدر تفاوت ہے۔؟ اسلام میں اعتقادات کی اساس توحید ہے اور عیسائیت میں تثلیث۔ اسلام میں جزا اور سزا کا مدار صرف اعمال صالحہ پر ہے جس کا حساب قیامت کے بعد ہوگا عیسائیت میں جزا و سزا کے تصورات کا ایک اہم رکن کفارہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام خدا کے لئے توالد وتناسل کے عقیدہ کا سخت مخالف ہے۔ عیسائیت کی اساس حضرت مسیح کو خدا کا فرزند تسلیم کرنے پر ہے۔

قرآن مجید میں بہت سے واقعات ایسے ضرور ہیں کہ بائبل میں بھی ان کا ذکر موجود ہے اور ایسا ہونا فطری تھا۔ اسلئے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے لیکن چونکہ بائیبل انسانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس کے بہت سے مضامین میں خدا ناترس انسانوں نے تحریف کر دی تھی۔ اس لئے ایسے مواقع پر قرآن بائبل کے بیان سے اختلاف کرتا ہے۔ مثلاً گوپرستی کے واقعہ میں حضرت ہارون کو بری قرار دیتا ہے۔ حضرت سلیمان کی حیات طیبہ پر جو غبار ڈالا گیا تھا، اس کو صاف کرتا ہے۔ حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کی تردید کرتا ہے۔ حضرت یوسف کو ایک پاکیزہ اور پاکباز پیغمبر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس طرح کے بہت سے مضامین ہیں کہ

ان میں بائبل اور قرآن مجید کے بیان میں اختلاف نمایاں ہے۔

قرآن مجید بعض ایسے تاریخی حقائق سے بھی پردہ اٹھاتا ہے کہ بائبل ان کے بارے میں خاموش ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کے شروع میں گائے والا واقعہ، اصحاب کہف کا واقعہ اور احسن القصص حضرت یوسف کی مفصل عبرت خیز اور موعظت انگیز داستان وغیرہ، یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر اسلام کی نبوت اور آپ کی تعلیمات میں سوائے وحی الہی کے کوئی خارجی محرک اور موثر کارفرما نہیں تھا۔ مگر افسوس کہ علماء مغرب کھلے دلوں پیغمبر اسلام کی نبوت کی صداقت پر غور کرنے اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی بحث و تحقیق کی پوری بنیاد ہی اس مفروضہ پر اٹھاتے ہیں کہ آپ نبی نہیں تھے اور پھر اس حقیقت ناشناسی کو "حقیقت" اور جھوٹ" کو "سچ" ثابت کرنے کے لئے ایسے دور از کار محرکات اور ناقابل فہم اسباب و وجوہ بیان کرتے ہیں۔ کہ عقل و دانش خندہ زن اور جبین انصاف عرق آلود ہوئے بغیر نہ رہے۔

مگر اہل ایمان کے لئے یہی انکار عین زیادت ایمان اور کمال ایقان کا باعث ہے۔ اہل علم کی طرف سے ایسی حقیقت ناشناسی ان کو یقین دلاتی ہے کہ علم کے باوجود گمراہی کی جو اطلاع قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کے معاصر اہل کتاب کے بارے میں دی تھی۔ مسلمان ہمیشہ اسکی صداقت و واقعیت کا بچشم سر مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

أفرأيت من اتخذ الٰهه هواه واضله الله على علم (الجاثیہ ۲۳)

---*---

حوالہ جات

معرکہ مذہب و سائنس ۱۰۱تا۱۰۹ (مترجم۔ مولوی عبدالحق صاحب)

(۲) تاریخ ابن خلادون۔ بقیتہ المجلد الثانی ۴

(۳) تاریخ طبری ۱\۵۶ ۴۔ الروض الانف ۱\۲۰۶

(۴) امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے۔ "ھذا حدیث غریب لانعرفہ الامن ھذا الوجہ، باب، جاء فی بدء نبوہ النبی ۲\۲۰۳، ابواب المناقب، نیز ملاحظہ ہو۔ الوفاء باحوال المصطفے ۱۳۰

(۵) عیون الاثر ۲\ ۵۷۔ صفتہ الصفوہ ۱\۶۹

(۶) طبقات بن سعد ۱\۱۲۰

(۷) صفتہ الصفوہ ۱\۶۶

(۸) الوفاء ۱۲۸

صفا

(۹) سیرت حلبیہ ۱\ ۱۹۵
(۱۰) سیرت حلبیہ ۱\ ۱۹۶
(۱۱) قال الذھبی فی الحدیث اظنہ موضوعاً، سیرت حلبیہ ۱\ ۱۹۷
(۱۲) و مع ذالک ففی متنہ نکارۃ، عیون الاثر ۱\ ۵۶
(۱۳) البدایہ والنہایہ ۲\ ۲۸۵
(۱۴) صفتہ الصفوہ ۱\ ۷۱
(۱۵) سیرت بن ہشام مع الروض ۱\ ۲۱۳، البدایہ والنہایہ ۲\ ۲۹۴
(۱۶) البدایہ والنہایہ، ۲\ ۲۹۴
(۱۷) عیون الاثر، ۱\ ۶۱
(۱۸) سہیلی کا بیان - والشجرۃ لا تعمر فی العادۃ ھذا العمر الطویل حتی یدری انہ لم ینزل تحتھا الا عیسی اوغیرہ من الانبیاء و یبعد فی العادۃ ایضا ان تکون شجرۃ تخلو من ان ینزل تحتھا احد، الروض ۱\ ۲۱۱
(۱۹) مفاتیح الغیب ۲۲\ ۵۰، کشاف ۳\ ۸۸، الجامع لاحکام القرآن ۷\ ۳-

****

امام ابن شہاب زہریؒ (۵۱ھ ـ ۱۲۴)

مولانا سرفراز احمد قاسمی، استاذ دار العلوم سبیل السلام

اسلامی تاریخ میں محدثین کی علمی جد و جہد اور قابل قدر علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس نازک دور میں جبکہ بعض بد باطن اور مفاد پرست عناصر نے اسلامی علوم کے صاف و شفاف سر چشمہ کو گدلا اور اس کے فطری چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کر رکھی تھی ۔ حفاظت دین کی اس تجدیدی تحریک میں جن نابغہ روزگار ہستیوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ان میں ابن شہاب زہری کا نام سر فہرست ہے کہ علم حدیث کا ادنی طالب علم بھی انکے نام و مقام اور روشن علمی کارناموں سے بے خبر نہیں ہو سکتا ۔

نام و نسب

نسب کچھ اس طرح ہے محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب بن عبد اللہ بن الحارث بن زھرہ ، کنیت ابوبکر تھی ۔ آپ زھری کی نسبت سے مشہور ہونے جو قبیلہ زھرہ ابن کلاب بن مرہ کی طرف منسوب ہے ۔ یہ قریش کا ایک مشہور قبیلہ ہے حضور (ص) کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا اور دوسرے بہت سے اجلئہ صحابہ بھی اس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس طرح آپ اپنی کنیت سے پہچانے جاتے تھے ، اسی طرح آپ کی شہرت "ابن شہاب سے بھی ہے جو آپ کے جد امجد عبد اللہ بن شہاب کی نسبت ہے جو اسلام کے خلاف دو مشہور معرکوں بدر و احد میں مشرکین کی صفوں میں تھے ۔ اسی دشمن اسلام خاندان سے یہ عظیم شخصیت خدمت دین کے لئے ظہور پذیر ہوی ۔

تعلیم و تربیت

والد کی وفات کے وقت آپ بہت مفلوک الحال تھے آپ کے بھائی کی روایت کے مطابق آپنے اولاً حفظ قرآن کی طرف توجہ کی پھر اپنے قومی اور خاندانی انساب کا علم حاصل کیا ، ان علوم سے فراغت کے بعد حدیث کے سماع کی طرف متوجہ ہوئے ۔ تاریخ ولادت میں مؤرخین کا سخت اختلاف ہے لیکن راجح قول کے مطابق ۵۱ ھ ہے (۲) آپ کا مولد " مدینۃ النبی " ہے (تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۸

اساتذہ وتلامذہ

صحیح تر روایت کے مطابق آپ نے دس صحابی رسول سے استفادہ کیا ہے جن میں انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ اور سھل بن سعد کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن علامہ بن حجر نے جن صحابی اساتذہ کی فہرست دی ہے۔ ان میں ان کے علاوہ عبداللہ بن جعفر، ربیعہ بن عباد، مسود بن مخرمہ، سائب بن یزید، شبیب، ابو جمیلہ، عبدالرحمان بن ازھر، محمود بن ربیع، عبداللہ بن ثعلبہ عبداللہ بن عامر، ابوامامہ، سعد بن سہیل اور ابوالطفیل وغیرہ بھی ہیں پھر آپ نے اپنے زمانے کے مشہور اور اکابر تابعین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جن میں سعید بن مسیب، عروہ ابن الزبیر اور فقہاء سبعہ زیادہ مشہور ہیں۔ بالا ستیعاب جن سے استفادہ کا موقع ملا وہ سید التابعین سعید بن مسیب ہیں جنکی درسگاہ سے آپ مسلسل آٹھ سال تک فیض یاب ہوتے رہے۔ انکے علاوہ بھی تابعین کی ایک بڑی جماعت ہے جن سے آپ نے کسب فیض کیا ہے۔ (۳)۔

آپکی درسگاہ انتہائی بافیض تھی جس سے علم کے صدہا کوکب وانجم ضیاء بار ہوئے، چنانچہ آپکے ممتاز شاگردوں میں امام مالک، امام اوزاعی، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، یحیی بن سعید انصاری، عمر بن عبدالعزیز اور عطاء بن رباح ہیں۔ انکے علاوہ ایک امت نے آپ سے فن حدیث استفادہ کیا ہے جنکی فہرست خاص طویل ہے۔ (۴)

شوق علم

آپ کو بچپن ہی سے حصول علم کا شوق جنون کی حد تک تھا اور اس راہ میں کبھی بھی جھوٹا وقار، عجب وغرور اور حیا و خجالت حائل نہ ہو سکی، جسکے پاس بھی خزانہ علم سے کچھ ملنے کی توقع ہوتی بے تکلف حاصل کرنے کی کوشش کرتے، اس میں نہ چھوٹے بڑے کی تخصیص تھی نہ مرد و عورت کی تمیز، چنانچہ آپکے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہیکہ آپ مدینہ کی گلیوں میں چکر لگاتے اور ہر چھوٹے بڑے سے حدیث سننے کے مشتاق ہوتے اور اس کے لئے بسا اوقات دشواریوں سے بھی گذرنا پڑتا۔

> ابراہیم بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ ابن شہاب کس بناء پر آپ سے علم میں فوقیت لے گئے تو میرے والد نے جواب دیا کہ وہ علمی مجلسوں میں ابتداء ہی سے حاضر رہتے اور کسی جوان یا بوڑھے شخص سے بھی ملتے تو ضرور ان سے سوال کرتے پھر انصار کے گھروں پر جاتے اور جس سے بھی ملاقات ہوتی چاہے مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان ضرور ان سے سوالات کرکے علم میں اضافہ کرتے۔ (۵)

جذبۂ شوق اور طلب حدیث کی انتہاء تھی کہ حصول علم کی خاطر حضرت عبداللہ بن عتبہ کی ایسی خدمت کیا کرتے تھے کہ انکی باندی سمجھتیں کہ یہ کوئی غلام ہے۔ (۶) یہ کیفیت صرف اساتذہ

سے کسب فیض تک ہی محدود نہ تھی بلکہ مطالعہ کے انہماک کی کیفیت یہ تھی کہ جب گھر میں تنہا ہوتے تو ہر چہار جانب کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں، دنیا و مافیہا سے بے خبر آپ، مطالعہ میں غرق رہتے۔ یہاں تک کہ انکی بیوی پر اتنا گراں اور شاق گذرتا کہ کہہ اٹھتیں کہ یہ کتابیں تو مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ (۷) نیز اسکی حفاظت اور تکرار و اعادہ کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ جب شام کو گھر پہونچتے تو عام طور پر باندی سو چکی ہوتی، اسے بیدار کرتے اور دن بھر کا سبق سناتے کہ فلاں محدث نے مجھ سے یہ بیان کیا اور فلاں نے یہ۔ باندی پریشان ہو کر کہتی میرا اس سے کیا تعلق! فرماتے میں جانتا ہوں کہ تجھکو کوئی فائدہ نہ ہوگا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے ان اسباق کا اعادہ کرلوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔ (۸)

ابوالزناد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ علماء کے پاس چکر لگاتے تھے اور زھری کے پاس تختیاں اور بیاضیں ہوتی تھیں، جن میں وہ تمام سنی ہوئی روایتیں لکھ لیتے تھے (۹) حصول علم میں ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ آثار صحابہ کو بھی باقاعدہ جمع کرتے، انکے ایک ساتھی صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ میں اور زھری ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے ہم لوگ احادیث نبوی لکھا کرتے تھے جبکہ زھری حدیث کے ساتھ آثار صحابہ بھی اگر مل جائے تو قلمبند کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کامیاب ہوئے اور میں ضائع ہو گیا (۱۰) خود زھری کا بیان ہے کہ مجھ سے قاسم بن محمد نے کہا کہ میں تم کو علم کا حریص دیکھتا ہوں تو کیا میں تمہاری رہنمائی ایسی شخصیت کی طرف کروں جو علم کا خزانہ ہے اور انہوں نے عمرہ بنت عبدالرحمان کی نشاندہی کی جو حضرت عائشہ صدیقہ کے گوشہ تربیت میں زیور علم سے آراستہ ہوئی تھیں جب میں نے ان سے ملاقات کی تو میں نے انہیں علم کا متلاطم سمندر پایا۔ (۱۱)

قوت حافظہ

ذکاوت و ذہانت، قوت استعداد اور افہام و تفہیم کی صلاحیت بھی خزانہ قدرت سے وافر مقدار میں ملی تھی، یہی وجہ تھی کہ ایک محدث کی تمام خصوصیت اور جامعیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اسی فطری صلاحیت کی وجہ سے اپنے ہم عمروں میں تفوق کا درجہ حاصل ہوا، حافظہ اتنا غضب کا تھا کہ جو کچھ جہاں سنا لوح دل پر نقش ہو گیا۔ حافظہ کا ایک واقعہ ہے جسکو اکثر مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ اموی ھشام بن عبدالملک نے آپ کے حافظہ کی شہرت سن کر آپ کا امتحان لینا چاہا۔ اس نے آپ سے درخواست کی کہ میرے فلاں لڑکے کو احادیث املاء کرادیں۔ آپ نے کاتب کو طلب کیا اور ۴۰۰ حدیثیں لکھادیں پھر ھشام نے امتحان کی خاطر مہینہ دو مہینہ کے بعد کہا کہ وہ کتاب کھو گئی اسلئے دوبارہ املاء کرادیں، امام زھری نے دوسری مرتبہ وہی ۴۰۰ حدیثیں املاء کرادیں، جب ھشام نے دونوں تحریروں کو ملایا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ پایا۔

(۱۲)

خود ابن شہاب کا بیان ہے کہ مجھکو کبھی کسی حدیث میں شک نہیں ہوا، سوائے ایک حدیث کے لیکن جب دوسرے ساتھیوں سے تحقیق کی تو وہی صحیح تھا جو میرے ذہن میں موجود تھا۔

(۱۳)

عبدالملک بن مروان کا عتاب اہل مدینہ پر شب و روز کا معمول تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنا طویل عتاب نامہ مدینہ بھیجا، تمام مدینہ والوں کے سامنے اسے سنایا گیا، جب لوگ سن کر واپس ہوئے تو حضرت سعید بن مسیب نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ کاش کوئی اس خط کی تفصیل سناتا، مختلف شاگردوں نے مختلف حصے سنائے، حضرت سعید بن مسیب مکمل متن سننے کے مشتاق تھے۔ ابن شہاب نے استاذ کی بےچینی دیکھی تو عرض کیا اگر آپ پورا متن سننا چاہتے ہوں تو میں سنا دوں چنانچہ ابن شہاب نے مکمل تحریر حرف بحرف سنا دی گویا کتاب سامنے رکھ کر تلاوت کر رہے ہوں (۱۴) امام بخاری نے اپنی تاریخ الکبیر میں اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ ابن شہاب نے صرف اسی (۸۰) دنوں میں حفظ قرآن مکمل کر لیا (۱۵)---

ان چند واقعات سے جو "مشتے نمونے از خروارے" کی حیثیت رکھتے ہیں آپ کے حافظہ کی قوت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسی ہی باکمال، جلیل القدر اور عبقری شخصیتوں نے علوم اسلامی کو اپنا خون جگر دے کر سیراب کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے حیات آفریں ذخیرہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

محدثین کی نگاہ میں

ابن شہاب زھری کا شمار اصاغر تابعین میں ہوتا ہے، محدثین کی ایک بڑی جماعت آپ کے محاسن اور خوبیوں میں رطب اللسان اور آپ کے علمی مقام و مرتبہ کی معترف نظر آتی ہے۔ مشہور محدث عمرو بن دینار فرماتے ہیں میں نے روایت حدیث میں زھری سے زیادہ ثقہ شخص نہیں دیکھا۔ (۱۶) لیث بن سعد کہتے ہیں کہ زھری ثقہ تھے کثیر العلم، کثیر الروایتہ اور فقیہ تھے۔ (۱۷) محدث جلیل امام نسائیؒ نے حدیث کی جن چار سندوں کو اصح ترین قرار دیا ہے ان میں سرفہرست زھری کی سند ہے (۱۸) عراک بن مالک سے پوچھا گیا کہ مدینہ میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے تو انہوں نے فرمایا سعید بن مسیب، عروۃ بن الزبیر اور عبید اللہ بن عبداللہ لیکن میرے نزدیک ان سب میں افقہ زھری ہیں جنہوں نے ان تمام کے علم کو جمع کر لیا ہے (۱۹) عمر بن عبدالعزیز اپنے ہم نشینوں کو کہا کرتے تھے کہ زھری سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا نیز یہی رائے مکحول الشامی کی بھی تھی (۲۰) علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحیح سند جن چھ حضرات تابعین تک پہونچتی ہے ان میں ابن شہاب زھری بھی ہیں (۲۱) یہی وہ خصوصیات

تھیں کہ اصحاب صحاح نے ان کی روایتوں کو قبول کیا ہے۔ انکی علم حدیث میں جلالت شان کا اندازہ امام مالک کے اس قول سے ہوتا ہے کہ جب زھری مدینہ آتے تو انکے قیام کی مدت میں کوئی محدث روایت حدیث نہیں کرتا تھا۔ (۲۲)

تدوین حدیث میں زہری کا حصہ

امام زہری نے یوں تو جس عصر میں نشوو نماں پائی ہے وہ خاص علمی حرکت و سرگرمی کا زمانہ ہے لیکن انہوں نے جس اہم علمی تحریک کی بناء ڈالی اور علم حدیث کو بحیثیت ایک فن وجود بخشا وہ یقیناً اس میں منفرد ہے۔ اور ان کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے اور اس کی وجہ سے ان کو تاریخ کے صفحات میں حیات سرمدی حاصل ہوگئی۔ زہری کی عظیم ترین خدمت تدوین حدیث ہے۔ اس موقعہ سے یہ بات مناسب ہوگی کہ تدوین حدیث کی تاریخ اور اس کے پس منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تاکہ زھری کی خدمات کی صحیح تصویر اور اسکی اہمیت سامنے آسکے -------- ابتداء اسلام میں جس طرح صحابہ نے قرآن کے حفظ کا اہتمام کیا تھا، اسی طرح صحابہ کرام نے احادیث رسول کو بھی محفوظ رکھا، ظاہر ہے جب قرآن کی کتابت باقاعدہ نہ ہو سکی تو حدیث کی کتابت اور تدوین کیوں کر ہوتی، لیکن جس طرح مکمل قرآن مختلف اجزاء میں مختلف اصحاب رسول کے پاس مکتوب شکل میں محفوظ تھا اور بعد میں حضرت عمر فاروق کی تحریک اور حضرت ابوبکر صدیق کے حکم سے باقاعدہ مصحف کی شکل میں مرتب ہوا۔ اسی طرح حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کا عام طریقہ کار تو حفظ کا تھا لیکن یہ بات پایہ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ بعض صحابہ نے حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا تھا مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے اپنے صحیفہ حدیث کا نام "الصادقہ۔ رکھا تھا، حضرت علی کے پاس بھی مکتوب احادیث کا ایک حصہ تھا جس میں دیت وغیرہ کے احکام تھے (۲۳) خود حضور (ص) نے جو فرمان والیان ریاست اور غیر مسلم فرمانرواؤں کے نام لکھے تھے اور خطوط بھیجے تھے سب مکتوب تھے اور آج تک محفوظ ہیں۔ تاہم صحابہ کے مابین یہ بات مختلف فیہ تھی کہ کتابت حدیث جائز ہے یا نہیں۔؟ اس لیئے کہ حضور نے ابتداء حدیث کی کتابت سے منع فرمایا تھا اور بعد میں اجازت مرحمت فرمادی تھی۔ چنانچہ بعض حضرات نے حضور سے قوت حافظہ کی کمی کی شکایت کی اور کتابت حدیث کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت مرحمت فرمادی (۲۴)

تدوین حدیث کا دوسرا دور حضور کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے جبکہ اسکی روایت صحابہ نے ایکدوسرے سے کی اور تابعین نے صحابہ سے کسب فیض کیا، لیکن صحابہ اور تابعین کے دور اول میں کتابت اور تدوین کو مکمل رواج نہیں ہوا کیوں کہ بعض محدثین کتابت حدیث کے مخالف تھے۔ جیسا کہ سعید بن مسیب کے بارے میں مشہور ہے کہ ابتداء کتابت حدیث

کے سخت مخالف تھے ۔ لیکن اخیر دور میں انہوں نے اسکی اجازت دیدی تھی ۔ چنانچہ انکے شاگرد عبدالرحمان بن حرملہ نے جب نسیان کی شکایت کی تو انہوں نے کتابت حدیث کی رخصت دی ۔ حضرت عبداللہ بن عباس جنکی شدت کتابت حدیث کے باب میں مشہور ہے جب انکے تلامذہ نے کتابت حدیث کی ضرورت اور اجازت طلب کی تو استاذ کی اجازت سے تلامذہ نے لکھنا شروع کیا (۵ ۔ ...) ۔ ۔ ے علماء محدثین کی طرح ابتداء میں ابن شہاب بھی کتابت حدیث کے مخالفین میں تھے اور محدثین کی نگاہ میں اسکی وجہ یہ تھی کہ اس سے قوت حافظہ میں کمی واقع ہوگی اور کتاب پر مکمل انحصار کرلیا جائے گا ۔ لیکن ابن شہاب کو جب عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے ترغیب ہوئی تو انہوں نے کتابت حدیث کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ اس کا بیان آگے آرہا ہے ۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ تابعین ہی کے دور میں کتابت حدیث کو محدود پیمانہ پر رواج حاصل ہوا ۔ لیکن جب لوگوں کے قومی اور حفظ میں کمی واقع ہوئی مشاغل دنیا نے مسلمانوں کو اس کام کے لئے فارغ نہیں رکھا اور ذخیرہ حدیث کے ضیاع کا اندیشہ پیدا ہوگیا تو سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باضابطگی کے ساتھ جمع وتدوین کی طرف محدثین کو متوجہ کیا ۔ (۲۷) ان کی یہ فکر اور تڑپ ان کے جدامجد حضرت عمر فاروق کی نگاہ دانشمندانہ کے عین مطابق تھی ۔ اس لئے کہ تدوین حدیث کی فکر اولا حضرت عمر فاروق ہی کو ہوئی تھی لیکن بعض اعذار اور مصالح کی بناء پر وہ اس کام سے باز رہے ۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی سے باضابطگی کے ساتھ تدوین حدیث کے کام کی ابتداء ہوتی ہے ۔ جبکہ کتابت حدیث کی ابتداء حضور کے زمانے ہی میں ہوچکی تھی اور بعد کو بھی یہ عمل مسلسل جاری رہا ۔

اس سے پہلے یہ بات آچکی ہے کہ زھری نے اپنے اساتذہ سے صرف حدیث کا سماع ہی نہیں کیا بلکہ مروجہ طرز تدریس سے الگ حدیثیں لکھا بھی کرتے تھے ۔ اور اس کا اہتمام کرتے تھے کہ حدیث کے علاوہ آثار صحابہ اور تابعین کے فتاوی بھی قلمبند کرلیں ۔ چنانچہ بہت سی روایتیں جو دوسروں کے پاس محفوظ نہیں تھیں ۔ امام زھری کے پاس محفوظ تھیں بعد کو محدثین نے انکی اس خصوصیت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے ۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر مالکی ابوالزناد کا قول نقل کرتے ہیں ۔

"ہم لوگ حلال وحرام کو لکھتے تھے اور زھری جو کچھ بھی سنتے لکھ لیتے ۔
جب اسکی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ زھری اعلم الناس ہیں ۔

امام زھری کے دوسرے ساتھی صالح بن کیسان نے بھی انکی اس خوبی کا ذکر کیا ہے ۔ فرماتے تھے کہ ابن شھاب کو ہم پر فضیلت حاصل ہوگئی ۔ اس لئے کہ وہ حدیث نبوی کے ساتھ آثار صحابہ کو بھی حدیث ہی کے قبیل کی چیز سمجھتے تھے اور قابل اعتناء سمجھ کر اسے بھی لکھ لیا

کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ حدیث تو نہیں لیکن حدیث کے بعد مصادر شریعت میں اہم حیثیت کا حامل ہے۔ خود ابن کثیر نے صالح بن کسیان سے ان کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔

"میں اور زھری ایک ساتھ طلب علم میں مشغول رہے، ہم نے کہا کہ حضور کے ارشادات کو قلمبند کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے وہ تمام اقوال لکھ لیا جو آپ سے مروی ہیں۔ پھر زھری نے مجھ سے کہا آثار صحابہ بھی ہمیں لکھنا چاہئے۔ کیوں کہ وہ بھی مصدر شریعت ہے میں نے کہا نہیں ہمیں اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں، زھری نے ان کو بھی لکھنا شروع کیا اور وہ کامیاب رہے میں نے لکھا نہیں اسلئے میں ضائع ہوگیا۔ (۲۹)

ابن شھاب کی کتابت حدیث کے اس شوق سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حفاظت حدیث کے کتنے حریص تھے۔ انکے اسی امتیاز کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے ہم نشینوں سے کہا کرتے تھے کہ سنت ماضیہ کا علم صرف زھری کے پاس ہے۔ ان سے اس علم کو حاصل کرلو۔ (۳۰)

پھر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اسکی فکر ہوئی تو انہوں نے اپنے عمال کو جمع حدیث کا حکم دیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف والی مکہ ابوبکر بن حزم کو ملا تھا، لیکن دوسری روایات سے ثابت ہے کہ یہ فرمان تمام گورنروں کو دیا گیا تھا۔ (۳۱) اور عقلا یہ قرین قیاس بھی ہے حکمنامے کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

"دیکھو جو بھی حضور کے ارشادات ملیں لکھ لو کیوں کہ مجھے
علم کے مٹ جانے اور علماء کے ختم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔" (۳۲)

روایات سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ انہوں نے اسی قسم کی تحریر عبداللہ ابن شھاب زھری کو بھی لکھی تھی (۳۳) اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو آپ سے جو حسن ظن تھا، اس کے تحت یہ روایت عین قرین صواب نظر آتی ہے چنانچہ محدثین کے یہاں یہ بات تقریبا متفق علیہ ہے کہ حدیث کے مدون اول ابن شھاب زھری ہیں (۳۴) کیوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے گو ابوبکر بن حزم نے بعض اجزاء مرتب کئے تھے لیکن حضرت عمر کی عمر نے وفا نہ کیا۔ اور ان کے جانشینوں کو دینی و علمی کاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اسلئے زھری ہی نے اس کام کو استقامت کے ساتھ انجام دیا۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے۔

"دوسری صدی کی ابتداء میں عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے جس نے سب سے پہلے حدیث کو مدون و مرتب کیا وہ ابن شھاب زھری ہیں پھر تصنیف و تالیف اور جمع و تدوین کا رواج چل پڑا۔

جس سے امت کو بڑا فائدہ پہونچا۔ (۳۵)

علامہ بن عبدالبر مالکی بھی جامع بیان العلم میں رقمطراز ہیں۔ من دون العلم وکتبہ ابن شہاب (۳۶) ابن کثیر نے امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ جس نے سب سے پہلے علم کو مدون کیا وہ ابن شہاب زھری، ہیں (۳۷) ان روایتوں کے مقابلہ علامہ رشید رضا (صاحب منار) کے اس دعوی میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی کہ حدیث کے مدون اول " خالد بن حمدان الحمصی" ہیں (۳۸)

حدیث میں جامعیت و احاطہ

امام زھری کے دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حدیث کی کتابت کے اہتمام اور ذوق و شوق کی وجہ سے بہت سی روایتیں جس کا دوسرے محدثین کو علم نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اسکی سند موجود نہیں تھی وہ امام زھری کے پاس موجود تھی۔ یہ وہ قیمتی علمی اثاثہ تھا جس کا امام مسلم نے بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔

"زھری سے ۹۰ ایسی حدیثیں عمدہ سند سے مروی ہیں جن کی روایت میں کوئی دوسرا شریک نہیں" (۳۸)

بعض حدیثوں میں جو تفرد اور اختصاص زھری کو حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید وہ احادیث ضائع ہوجاتیں، چنانچہ سعید بن عبدالرحمان نے لیث بن سعد سے کہا کہ اے ابو حارث! اگر زھری نہ ہوتے تو حدیث کا بڑا حصہ ضائع ہوجاتا۔ (۴۰)

فقہی مقام

زھری کی خصوصیت صرف فن حدیث تک محدود نہ تھی بلکہ فن فقہ میں بھی اپنے ہم عصروں سے فائق اور بلند درجہ رکھتے تھے علی بن مدینی کہا کرتے تھے کہ جن چار حضرات کے فتاوی مقبول عام ہیں ان میں زھری بھی ہیں اور میرے نزدیک وہ سب سے افقہ ہیں (۴۱) آپ نے جس طرح فن حدیث کے چمن کو سیراب کیا ہے اسی طرح آپ نے فقہ کی بھی آبیاری کی ہے۔ یہی علمی جلالت شان تھی کہ آپ مدینہ کے مسند افتاء پر بٹھائے گئے۔ ابن جوزی نے اعلام الموقعین میں جہاں فقہاء مدینہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ محمد بن نوح نے آپ کے فتاوی کو تین ضخیم جلدوں میں ترتیب سے مدون کیا تھا۔ (۴۲)

فیاضی و سیر چشمی

وہ جامع علم اور صاحب کمالات ہونے کے ساتھ ساتھ سخاوت و فیاضی میں بھی اپنی نظیر

نہیں رکھتے تھے، جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی سائل کو خالی واپس نہیں کیا۔ اپنے پاس اگر نہیں ہوتا تو دوسروں سے قرض لے کر ضرورت مندوں کی امداد کرتے اسی سخاوت کی وجہ سے پوری زندگی کبھی قرض کے بوجھ سے خالی نہ رہے۔ بسا اوقات یہ فیاضی دوست اور رفقاء کو گراں گذرتی اسلئے کہ وہ آپ کو مفلوک الحال دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد بن عبدالعزیز نے ولید بن محمد سے کہا کہ زھری کے اوصاف بیان فرمائیے۔ انہوں نے تمام اوصاف شمار کئے اور فرمایا کہ ایک دن میں نے زھری سے کہا کہ آپ میں ایک خامی ہے اور وہ ہے قرض لینا زھری نے کہا کہ میرے اوپر صرف چار ہزار قرض ہے اور میرے پاس چار باندیاں ہیں کہ ہر ایک کی قیمت ۴۰ ہزار ہے۔ (۴۳)

انکی سخاوت کے سلسلہ میں بعض دلچسپ واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ مثلاً کوئی سائل آتا اگر اپنے پاس درہم و دینار ہوتا تو عطاء کرتے ورنہ قرض لے کر دیتے بلکہ بعض دفعہ اپنے غلاموں سے قرض لینے کی نوبت آتی۔ اسی طرح ایک واقعہ لکھا ہیکہ ایک مرتبہ ایک چشمہ سے گذر ہوا۔ چشمہ والوں نے عرض کیا کہ انکے پاس اٹھارہ بوڑھی عورتیں ہیں اور کوئی خادم ہے اور نہ کوئی دوسرا مددگار، زھری نے فوراً ۱۸ ہزار درہم قرض لیا اور ہر ایک کے لئے خادمائیں خرید کر حوالہ کیں۔ (۴۴)۔ امام مالک فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ملنے والوں میں زھری سے زیادہ سخی کسی کو نہیں دیکھا (۴۵) باوجودیکہ امام زھری نے چھ اموی خلفاء کا دور دیکھا ہے اور ہر ایک نے آپکی عزت و تکریم کی ہے اور ہدایا و تحائف سے نوازا ہے۔ لیکن فیاضی کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے یہاں تک دوستوں کو ادا کرنا پڑتا۔ (۴۶) خدا نے طبیعت میں غنی فیاضی اور سیر چشمی دی تھی اسی نسبت سے مال و دولت بھی دی تھی، لیکن کبھی حرص نہیں کی بلکہ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ درہم و دینار کی بے وقعتی میں نے تو زھری سے زیادہ کسی کی نظر میں نہیں دیکھی گویا اسکی حیثیت انکے نزدیک اونٹ کے مینگنی کی تھی۔ (۴۷)

وفات

آخر ش یہ مرکز علم و فن صحیح روایت کے مطابق ۱۷ رمضان سہ شنبہ ۱۲۴ ہجری کو اس دار فانی سے رخصت ہوا (۴۸) انکے مدفن کے بارے میں بھی مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ مقام شغب۔ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔ جو علاقہ حجاز کا آخری علاقہ ہے اور فلسطین کی سرحد پر واقع ہے۔ (۴۹)

مراجع

(۱) السنتہ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی ص ۲۰۸ مطبوعہ بیروت
(۲) حوالہ سابق ص ۲۰۸

(۳) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۶ مطبوعہ حیدرآباد دکن
(۴) حوالہ سابق
(۵) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۵۰ والسنتہ ص ۲۰۸
(۶) السنتہ ص ۲۰۸
(۷) وفیات الاعیان ۴\ ۱۷۷ والسنتہ ص ۲۰۹
(۸) السنتہ ص ۲۰۹
(۹) تذکرۃ الحفاظ ج ۱\ ۱۰۹ مطبوعہ حیدرآباد دکن
(۱۰) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۸
(۱۱) تدکرہ الحفاظ ج ۱\ ۱۱۲
(۱۲) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۹ والسنتہ ص ۲۰۹
(۱۳) السنتہ ص ۲۰۹ ۔ ما استعدت حدیثا قط و ما شکلت فی حدیث الاحدیثا واحدا فسالت صاحبی فاذا هوکما حفظت
(۱۴) حوالہ سابق
(۱۵) الحدیث المحدثون ص ۱۷۴
(۱۶) حوالہ سابق
(۱۷) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۸
(۱۸) السنتہ و مکانتہا ص ۲۱۰
(۱۹) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۸
(۲۰) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۹
(۲۱) السنتہ ص ۲۱۰
(۲۲) البدایہ والنہایہ ۔ ۹\ ۳۴۳ مطبوعہ بیروت
(۲۳) تفصیل کے لئے دیکھا جائے تدوین حدیث از مولانا مناظر احسن گیلانی
(۲۴) ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم اذن لرجل سیئی الحفظ بان یستعین بیمینہ ترمذی شریف بحوالہ الحدیث المحدثون ص ۲۲۲
(۲۵) جامع بیان العلم و فضلہ ۱\ ۷۳ مطبوعہ بیروت
(۲۶) السنتہ ص ۱۰۵
(۲۷) فتح الباری ۱\ ۲۷۷ مطبوعہ بیروت
(۲۸) کنا نکتب الحلال والحرام و کان ابن شہاب یکتب کل ما سمع فلما احتیج الیہ علمت انہ اعلم الناس جامع بیان العلم و فضلہ ۱\ ۷۳
(۲۹) البدایہ والنہایہ ۹\ ۳۴۴

(۳۰) ابن خلکان ۴\ ۱۶۶ مطبوعہ بیروت

(۳۱) تفصیل کے لئے دیکھا جائے السنتہ و مکانتہا ص ۱۰۴

(۳۲) الحدیث والمحدثون ص ۲۴۴ انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء

(۳۳) حوالہ سابق

(۳۴) السنہ ص ۲۱۱

(۳۵) فتح الباری ج ۱\ ۲۷۲ اول من دون الحدیث ابن شهاب علی رأس المائۃ با عمر بن عبدالعزیز ثم کثر التدوین ثم التصنیف و حصل بذلک خیر کثیر ----

(۳۶) جامع بیان العلم و فضلہ ۱\ ۷۳

(۳۷) البدایہ والنہایہ ج ۹\ ۳۴۵

(۳۸) ملاحظہ ہو الحدیث والمحدثون ص ۲۲۰

(۳۹) مسلم شریف ج ۲\ ۴۶ مطبوعہ دیوبند، ہندوستان

(۴۰) السنہ ص ۲۱۲

(۴۱) البدایہ والنہایہ ج ۹\ ۳۴۵

(۴۲) اعلام الموقعین ج ۱\ ۲۳، مطبوعہ بیروت

(۴۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱\ ۱۱۱ مطبوعہ حیدر آباد دکن

(۴۴) السنہ ص ۲۰۸

(۴۵) تہذیب التہذیب ۹\ ۴۴۹

(۴۶) السنہ ص ۲۰۸

(۴۷) السنہ ص ۲۱۶

(۴۸) الانساب [illegible] ۳۵۰ مطبوعہ حیدر آباد دکن

(۴۹) تفصیل کے لئے دیکھا جائے - ابن خلکان ج ۴ [illegible] ۷۷، الاعلام ج ۷ [illegible] ۹۷ مطبوعہ بیروت

نواب بہادر یار جنگ مرحوم اور قرآن حکیم

محمد رضوان القاسمی

تم نے اللہ میاں سے آج باتیں نہیں کیں، اس لئے نہ میں تم سے بات کروں گی، اور نہ تمہارا سلام لوں گی"۔۔۔۔ محمد بہادر خان نواب بہادر یار جنگ مرحوم (۱۹۰۵ء-۱۹۴۴) اپنی کم سنی کے زمانے میں کسی دن معمول کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتے اور اس دن نانی صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کرتے تو ان کی نانی ان سے یہ جملہ فرمایا کرتی تھیں، جس میں محبت آمیز خفگی بھی تھی، بلاناغہ پابندی کی ہدایت بھی تھی، اور آئندہ کے لئے جن خطوط اور بنیادوں پر ان کے فکر و نظر اور ذہن و دماغ کو تشکیل دینا تھا، اس کی طرف اشارہ بھی تھا۔

یہ واضح رہے کہ نواب بہادر یار جنگ کی پیدائش کے صرف ایک ہفتہ بعد ہی ان کی والدہ محترمہ دار فانی سے رحلت کر گئی تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد سے (۱۴) سال تک وہ اپنی نانی صاحبہ کے زیر تربیت رہے۔ نانی صاحبہ دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں اور دل و جان سے چاہتی تھیں کہ ان کا سونہار اور ذہین نواسہ مذہبی اور دیندار بنے اور اس پر اللہ کا رنگ (صبغتہ اللہ) چڑھے، جس رنگ سے بہتر کوئی دوسرا رنگ نہیں ہو سکتا۔ (و من احسن من اللہ صبغتہ) اس لئے وہ ہمیشہ اپنے نواسے کو مذہبی زندگی گزارنے اور نماز اور قرآن پڑھنے کی ہدایت کرتی رہتی تھیں۔ یہ ہدایت کس درجہ بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی مجلس میں جب کبھی مادری تربیت کی اہمیت کا ذکر آتا تو نانی صاحبہ والا مذکورہ واقعہ ضرور بیان فرماتے اور یہ کہتے کہ "میرے اندر جو کچھ ہے، وہ اسی چودہ ۱۴ سال کی کمائی کا حاصل ہے"۔

مذکورہ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو مذہب اور قرآن سے لگاؤ اور تعلق دراصل نانی صاحبہ کی تربیت سے پیدا ہوا۔ جب وہ اپنی عمر کے چودھویں سال میں داخل ہوئے تو ان کے اس رجحان کا ان کے والد محترم (نواب نصیب یاور جنگ ثالث مرحوم) نے بھی خیال رکھا اور انھیں موقع دیا کہ وہ مولوی سعادت اللہ خاں صاحب (پرنسپل قدیم مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد) اور علامہ سید اشرف شمسی صاحب (صاحب تفسیر شمسی) سے شرف تلمذ اختیار کر کے عربی ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ کی باضابطہ تعلیم حاصل کریں۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ شمسی کی صحبت نے بہادر یار جنگ کے علمی، مذہبی اور قرآنی ذوق و شوق کو خوب نکھارا اور کافی پروان چڑھایا۔ بعض حالات کے تحت باضابطہ تعلیم کا تعلق زیادہ دیر تک باقی تو نہ

رہا، لیکن انھوں نے اپنے مطالعہ کی وسعت سے مدرسوں اور کالجوں کی نصابی اور روایتی تعلیم سے کہیں زیادہ علم حاصل کیا۔ معمولاً روزانہ دو ڈھائی سو صفحات کا مطالعہ کرتے تھے (مطالعہ کا ان کا اپنا ایک انداز تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے کیا ہے) یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد جب جاگیر کی ساری ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آپڑیں تو اس زمانہ میں بھی ان کا مطالعہ نہ چھوٹا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ۔ "جاگیر کے مقدمات کے سلسلہ میں جب وہ وکلاء صاحبان کے پاس جایا کرتا تو بگھی میں بیٹھے ہوئے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔۔ وہ یہ بھی فرماتے کہ دو چیزوں کو دیکھ کر رگوں میں خون کی گردش تیز ہوجاتی ہے ایک اچھی کتاب اور دوسرے اچھا ہتھیار"۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کا کتب خانہ بہت وسیع تھا اور اس کا بڑا حصہ مختلف قدیم و جدید تفاسیر اور دیگر مذہبی کتب پر مشتمل تھا۔ ان کتابوں میں اکثر عربی زبان کی کتابیں تھیں جن کا مطالعہ وہ پورے غور و فکر اور تدبر و تفحص کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی اسی ذاتی محنت اور مطالعہ سے اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی میں بھی بولنے اور لکھنے کی بہترین صلاحیت پیدا کرلی تھی اور علمی اور ادبی اعتبار سے اتنا اونچا مقام حاصل کرلیا تھا وقت کے اکابر علم اور اساطین ادب نے بھی انہیں اپنا بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ تاہم ان کی زندگی کے حالات کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کی کتابوں میں تفسیر کی کتابیں ان کا خاص محور اور مرکز ہوا کرتی تھیں۔ اسی ذوق نے انھیں خدا کی لازوال بے مثال اور آخری دعوتی اور اصلاحی کتاب "قرآن حکیم" کا بہترین خادم بنادیا اور اپنی بے شمار خدمات میں سب سے زیادہ اہم اور اشرف خدمت اسی خدمت کو خیال فرماتے تھے اور کہتے:

"مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ بہادر یار جنگ کی شہرت سیاسی پلیٹ فارم سے ہوئی مگر انھوں نے اپنے دین کو سیاست سے جدا نہیں کیا تھا۔ یہاں ان کی دینی اور قرآنی بصیرت پورے طور پر کام کرتی رہی، دین اور قرآن سے وابستہ ہونے اور اسے دوسروں تک پہنچانے اور عام کرنے کی تلقین، پوری قوت کے ساتھ کرتے رہے۔ ۱۳۶۰ء میں "اتحاد المسلمین" کے جلسہ سالانہ کے موقع پر انھوں نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا تھا وہ اس سلسلہ میں نہایت اہم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن کے بارے میں کس قدر حساس، اس سے کتنا والہانہ لگاؤ، اور اس کی عظمت و اہمیت اور انقلابی تاثیر کے کس درجہ معترف تھے۔ خطبہ کا ایک حصہ ملاحظ فرمایئے:

> "یہ بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی قوم زندگی کے اہم مراحل میں اپنی بنیادوں کے استحکام کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہر زمانہ قوموں کی تعمیر کے لئے چند لوازمات چاہتا ہے اور ان لوازمات کے بغیر اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ استوار اور مضبوط نہیں ہوسکتا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ

ان کی انقلابی ترقیاں جن کو دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی چند خصوصیات کی سرمایہ دار تھیں۔ ان میں سب سے پہلی چیز اپنی حیات اجتماعی کے مقاصد و منشاء کی نسبت مسلمانوں کا وہ صحیح تصور وایقان تھا جو قرآن نے ان میں پیدا کردیا تھا۔ انسان کا تصور وایقان ہی اس کے عمل کی اصل اور بنیاد ہے اور وہ بلندئ تخیل اور رفعت تصور جو قرآن نے مسلمانوں کو عطا کیا، اس کی ذلتوں کو عزت سے اور محکومیوں کو حکومت سے بدلنے کا باعث ہوا۔ قرآنی تعلیمات کے سوا اور کون سی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاج خسرو اور تخت کسریٰ کا مستحق بنادیا تھا۔۔

اس کے بعد فرمایا:

"زمانہ نے ممکن ہے راستوں میں کچھ تبدیلی کردی ہو لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلت وخواری کے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت میں آپ سب ارکان مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکان عاملہ و شوریٰ مملکتی مجلس، صدر صاحبان و عہدہ داران مجالس ضلع و ابتدائی مبلغین مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً رکنیت مجلس کی شرط اولین کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک، عمل کی نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھ کر قرآن مجید کی کم از کم تین آیتیں روز تلاوت کیا کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھہرائے بلکہ ماہانہ تختہ رپورٹ میں جو مملکتی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے بہ صداقت دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اس شرط کا پابند رہا ہے۔ میری اس عمل پر مزاولت نے ثابت کیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاح انفرادی و اجتماعی کے نئے دروازے کھولتا ہے ----- ہماری ہر شاخ کا فرض ہے کہ آبادی کی کسی مسجد میں کسی پڑھے لکھے مسلمان کے ذریعہ قرآن اور اس کا کوئی مستند ترجمہ سنانے کا انتظام کرے"۔

اسی طرح انتقال سے صرف ایک ماہ قبل مجلس کے سالانہ اجلاس منعقدہ شہر ورنگل میں بہادر یار جنگ نے اپنے صدارتی خطبہ کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا کہ "اگر آپ چاہیں تو مجھے رجعت پسند اور دقیانوسی خیال کا حامل کہیں مگر میں آپ کے موجودہ مسائل کا واحد علاج آپ کے مسلمان ہوجانے میں سمجھتا ہوں۔ مسلمان ہوجانے سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کا زاویہ فکر اور نقطۂ نظر اسلامی ہوجائے۔ آپ حالات کا اسلامی نظر سے مطالعہ کرنے لگیں اور معاملات کو اسلامی فکر سے سوچنے لگیں۔ اس کیفیت کے پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن حمید کی

بامعنی تلاوت کو اپنا وظیفہ حیات بنائیے اور سونے سے پہلے سوچئے کہ آپ آج اسلام سے کس قدر دور یا قریب سوتے ہیں۔

قرآن حمید کی بامعنی تلاوت کو وظیفہ حیات بنانے کا یہی شدید جذبہ تھا، جس کے زیر اثر نواب بہادر یار جنگ نے صرف ذاتی مطالعہ پر اکتفاء نہ کیا بلکہ باقاعدہ درس تفسیر کا آغاز کردیا۔ اس سلسلہ کی بعض جزئیات اور تفصیلات جیسے نواب صاحب کے درس تفسیر کی تقریباً ہر مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے والے جناب ابو منظور شیخ احمد نے بیان کی ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے سامنے جو ہر پنجشنبہ کی شام کو ان کو ڈیوڑھی پر جمع ہوتے تھے، تاریخ اسلام پر مسلسل لیکچر دیتے۔ ہر جمعہ کو درس اقبال کا حلقہ ہوتا، جس میں ماہرین اقبالیات کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور اقبال کا کلام سبقاً سبقاً پڑھا جاتا البتہ درس تفسیر روزانہ بعد نماز فجر اپنے محلہ کی چھوٹی سی مسجد میں ایک گھنٹہ تک پابندی سے دیا کرتے تھے۔ یہ درس صرف انہی دنوں میں ناغہ ہوتا جن میں وہ حیدرآباد سے باہر دورہ پر جایا کرتے تھے۔ آخری تین چار برسوں میں مسلسل جسمانی مشقتوں اور دماغی کاوشوں اور قلبی مؤثرات نے نواب صاحب کی صحت کو بہت زیادہ خراب کر دیا تھا اور نزلے اور گلے کے مرض نے مستقل صورت اختیار کرلی تھی، حتی کہ سردیوں میں صبح دس ۱۰ بجے تک بلند آواز سے بات بھی نہ کر سکتے تھے اس کے باوجود درس تفسیر میں خلل واقع نہ ہونے دیا۔ لوگوں کو اپنے سے بہت قریب کرلیتے اور انتہائی پست آواز میں چشم وابرو کو وضاحت کا آلہ بناتے ہوئے تفہیم و تشریح فرمایا کرتے۔ اپنی وفات سے ایک روز قبل ۳ رجب ۱۳۶۳ھ یکشنبہ کو حسب معمول سورہ بقرہ کی آیت نمبر (۱۹۳) کی تفسیر بیان فرمائی تھی۔

ایک مرتبہ درس ختم ہونے کے بعد حسب عادت دعائے ماثورہ (اللھم ارحمنا بالقران العظیم) پڑھی۔ نہ معلوم کیا خیال آیا گریہ طاری ہوگیا۔ فرمانے لگے "خانۂ خدا میں بیٹھے کتاب اللہ کو ہاتھ میں لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ساری ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہی ان کی پناہ گاہ ہے۔۔۔۔۔ اس لئے ان کو شکایت تھی کہ جو لوگ میری تقریروں کو ایسی دل بستگی سے سننے کے عادی ہیں وہ تفسیر میں کیوں شرکت نہیں کرتے۔ حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے"۔ ان کے اسی اخلاص کا نتیجہ تھا کہ انھیں کبھی شرکاء تفسیر کی تعداد کا خیال نہ آیا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ معمول کے پندرہ بیس آدمیوں کے بجائے صرف دو ہی سامعین رہے لیکن وہ برابر تفسیر سناتے رہے اور اسی طرح مطالب بیان کرتے رہے۔ ہزاروں کے مجمع میں تقریر کرنے والے کسی مقرر کے لئے نفسیاتی اعتبار سے یہ کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ مگر جب اندر سے اخلاص ہو اور دل جوش دعوت و تبلیغ سے بھرا ہوا ہو تو تعداد کی قلت و کثرت کوئی

فرق پیدا نہیں کیا کرتی --- دہلی کے ایک قدیم بزرگ نے جامع مسجد میں ہزاروں آدمیوں سامنے دو گھنٹے تقریر کرنے کے بعد، پیچھے آنے والے ایک شخص کی خواہش پر جامع مسجد کی سیڑھی پر ہی کھڑے ہوئے اسی جوش و خروش کے ساتھ اپنی پوری تقریر سنائی تھی۔ تاریخ نے اس معاملہ میں بہادر یار جنگ کی شکل میں اپنے آپ کو دہرایا تو تعجب کیوں اور حیرت کیسی؟۔

نواب صاحب مرحوم نے اپنے اندر جو لیاقت پیدا کرلی تھی، اس کے لحاظ سے وہ تفسیر بیان کرنے کے اہل تھے لیکن ایک دفعہ کسی نے اعتراض کیا کہ "نواب صاحب کا یہ مقام نہیں ہے۔ تو اس کا کچھ برا مانے بغیر نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ بلیغ جواب دیا کہ "میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سناتا ہوں۔ میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کرلیا کرتا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر یہی کام مسجد میں ہو اور بجائے خاموش سوچنے کے باواز بلند کہتا جاؤں (اس مطلب کو مرحوم اکثر LOUD THINKING کے لفظ سے ادا کرتے تھے) تو دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ بس اس وجہ سے یہاں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا ہے"۔

ایک مرتبہ تفسیر میں اسی قسم کے اعتراض کو دہراتے ہوئے کہنے لگے کہ "عموماً بڑے طبقہ کے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ارے نصیب یاور جنگ کے گھر میں تو ہمیشہ گانا بجانا ہوا کرتا تھا۔ آج یہ بہادر خاں کو کیا سوجھی ہے کہ جو قرآن پڑھانے بیٹھا ہے"---اس پر سب حاضرین ہنس پڑے اور خود مرحوم بھی ہنسی کو ضبط نہ کرسکے۔

جناب ابو منظور شیخ احمد کا بیان ہے کہ بہادر یار جنگ مرحوم اور تقریروں کے لئے تو شاید ہی کبھی تیاری کرتے تھے لیکن تفسیر بڑے اہتمام سے سناتے تھے۔ رات میں سونے سے قبل ایک گھنٹہ یا صبح نماز فجر سے پہلے جس آیت کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اس سے متعلق مختلف نئی پرانی تفسیریں دیکھ ڈالتے تھے، اور ساتھ ہی مختلف ترجمے پیش نظر رکھتے تھے۔ درس تفسیر کے لئے مرحوم پوری سادگی کے ساتھ کرتہ اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی رح (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) کے ترجمہ والی حمائل ساتھ لئے مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ نماز خود ہی پڑھاتے اور نماز کے بعد نہایت رقت و صدق دل سے دعائیں مانگتے اور "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ" والی دعا کی تکرار چار چار پانچ پانچ بار کرتے پھر دعا ختم کرکے بڑی دیر تک سر جھکا کر روتے اور گڑگڑاتے۔ اس کے بعد کلام پاک کھولا جاتا۔ تلاوت آیت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف انداز میں سناتے۔ حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ بھی بتادیتے۔ سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے۔ جب خود ترجمہ کرچکتے تو پوچھتے کوئی ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابل ترجیح ہے۔ آپ جسے چاہیں اختیار کریں۔ اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اصول بتادیئے جاتے۔ لغات کی تشریح ہوتی اور پھر مطالب و مسائل زیر بحث آتے۔ درس میں بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے۔ فلسفہ کی

گتھیاں سلجھائی جاتیں۔ فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں سنائی جاتیں۔ آیات کو پڑھ کر بار بار وجد کرتے اور فرماتے "آہاہا کیا بات فرمائی گئی ہے"۔ روزانہ بالعموم ایک ہی آیت کی تفسیر ہوسکتی تھی اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار چار پانچ پانچ روز تک بیان ہوتی رہتی تھی۔

قرآن شریف پڑھنے اور پڑھانے کے دوران میں شدت تاثر کا یہ عالم ہوتا کہ بے اختیار آنکھیں اشکبار ہوجاتیں۔ بار بار ایسا اتفاق ہوا کہ ادھر قرآن مجید کی آیتوں پر ایک نظر ہی پڑی تھی اور ادھر دل کی کیفیتیں آنکھوں کی زبانی ظاہر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہچکیاں بندھ گئیں اور جب کافی وقت گزرنے پر بھی قابو نہ حاصل کیا جاسکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی۔

ایک روز رمضان کے مہینے میں حسب دستور درس کے لئے مسجد آئے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ آتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ادھر نیت باندھی ادھر گھگی بندھ گئی۔ بڑی مشکل سے نماز ختم کی۔ تھوڑی دیر تک حسب عادت مراقبہ میں رہے۔ پھر درس شروع ہوا۔ لیکن آنسو برابر جاری تھے۔ جب تک تفسیر سناتے رہے، اشکوں کا سیلاب بہتا رہا۔ تفسیر ختم کرکے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دل کا درد ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ دعا ختم کرکے حاضرین کو مخاطب کیا اور صرف اتنا کہا کہ "میاں قرآن پڑھو"۔ ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو بھرا ہوا تھا کہ سب کے سب زار و قطار رونے لگے۔ اسی کو کہتے ہیں "از دل خیزد، بر دل ریزد"۔ یعنی دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

تفسیر میں جب ایک پارہ ختم ہوجاتا تو بڑی ہی احسان مندی سے اللہ کی جناب میں حمد و ثنا کرتے اور شکر کرتے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندے سے اتنی تفسیر سنانے کا کام لیا۔ جب ۶ سال کی طویل مدت کے بعد قرآن مجید ختم ہوسکا تو مسرت و انبساط کا جو عالم مرحوم پر طاری تھا، اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ بس آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے۔ خوشی سے بار بار اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے جاتے تھے۔ اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین کو کھانے پر مدعو کیا اور پر تکلف دعوت دی باوجود ملازم کی موجودگی کے خود سربراہی میں مصروف تھے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنانے تو نواب صاحب فرمانے لگے:

"لائیے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ۲ ہی دن رہے ہیں۔ ایک وہ جبکہ زیارت بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا اور ایک آج جبکہ اس کے فضل و کرم سے ۶ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کرسکا ہوں"۔

اس موقع پر ایک صاحب نے عرض کیا نواب صاحب! یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے مرحوم نے فرمایا "آپ کو یہ کیسے گمان ہوگیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کردوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا"۔ (تلخیص از بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر صفحہ ۱۷۱ تا ۱۸۰)

نواب صاحب کی تفسیر کس قدر جامع ہوتی تھی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام محمد بی۔اے (کراچی) نے لکھا ہے کہ "وہ جیسے نام نہاد علماء، عالم کہتے ہوئے عار محسوس کرتے تھے ایسی جامع و مانع تفسیر سنایا کرتا جو ان جیسے پچاسوں کے لئے بصیرت کا باعث تھی۔ کاش شریک ہو کر استفادہ کرتے لیکن نفس پرستی کی بیڑیاں تھیں، سند کی فصیل حائل تھی ان کو توڑنا کوئی آسان بات تو نہ تھی"۔

بہادر یار جنگ کے حلقہ تفسیر میں بیٹھنے والوں کا جو قرآنی ذوق بنا تھا، اس کا اندازہ جناب ابو منظور شیخ احمد کے بیان کردہ اس مؤثر واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ وفات سے ایک روز قبل جو تفسیر بیان فرمائی تھی تو تفسیر کے بعد چاہتے تھے کہ تمام شرکاء کے نام پوچھیں اور ایک دوسرے سے تعارف ہو۔ لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث سارے حاضرین سے نام نہ پوچھ سکے صرف ایک شخص سے نام دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا "تفسیر علی"۔ نام بڑا معنی خیز تھا لیکن کچھ عجیب سا۔ اس لئے اس پر ایک خفیف سا قہقہہ پڑا اور مرحوم نے بھی سنجیدگی سے تبسم فرمایا۔

یہ تفسیر علی ادھیڑ عمر کے ایک انتہائی غریب شخص تھے۔ موز (کیلے) بیچا کرتے تھے۔ مسجد ننگے پیر آیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے آتے اور نماز روزانہ جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے۔ درس تفسیر کے وقت نہایت ادب اور عقیدت سے بیٹھتے تھے، اور غالباً تلنگی زبان میں کچھ نوٹ بھی کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی نواب صاحب مرحوم سے کوئی سوال بھی کیا کرتے تھے، (ابو منظور شیخ احمد کہتے ہیں کہ) میرے ایک محب صادق جناب صادق احمد صاحب بی، اے (حیدرآباد) کا بیان ہے کہ مرحوم کی وفات پر پندرہ بیس دن گزرے تھے، جب کالج جارہا تھا، جب رزیڈنسی روڈ سے میرا گذر ہوا تو میری نظر تفسیر علی پر پڑگئی دیکھتا کیا ہوں ایک لکڑی میں آگے پیچھے دو ٹوکریاں لٹکائے اور ان میں کیلے رکھے ہوئے اپنی دھن میں کچھ آواز سے قرآن مجید کی بعض سورتیں پڑھتے اور ورد کرتے چلے جارہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا اور رقت طاری ہوگئی میں نے دل میں کہا کہ جس شخص نے مرحوم کی تفسیر سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور عمل کیا وہ یہی ہیں جو اب ننگے پیر میں لیکن حلال کی روزی اللہ کی راہ میں کام کر کے کھاتے ہیں اور جب ہم شرکاء تفسیر قیامت کے دن ایک گروہ کی شکل میں گزریں گے تو ہماری صف میں آگے یہی تفسیر علی ہوں گے۔

(بہادر یار جنگ، مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۱۸۲،۱۸۱)

ایک نوجوان صحافی جناب عبد الحمید نظامی ایم، اے (نوائے وقت لاہور) نے بہادر یار جنگ مرحوم کے نام ایک خط لکھا جس میں انھوں نے اپنے بعض حالات اور کیفیات کا ذکر کیا تھا مرحوم نے ۱۴ مارچ ۱۹۴۴ء کو انھیں جو جواب دیا وہ بڑا ہی بصیرت افروز اور ان کے قرآنی تدبر کا مظہر ہے۔ لکھتے ہیں:

"اگر آپ اپنے ایک بھائی کا مشورہ پسند کریں تو اب جبکہ اقبال اور رومی کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں، قرآن سے قریب ہونے کی کوشش کیجئے۔ اس سلسلہ میں اپنے چند تجربوں کو بطور مشورہ عرض کر دوں۔ آج کل کے انداز فکر و بیان سے جو لوگ متاثر ہیں وہ تلاوت قرآن کی ابتدائی منزلوں میں کچھ پریشان سے ہو جاتے ہیں۔ وہاں ان کو قرآن سے عدم موانست کی وجہ سے ابتداء کچھ بے ربطی عدم تسلسل اور پراگندہ خیالی (نعوذ باللہ) نظر آنے لگتی ہے۔ طالب قرآن کی یہی منزل سب سے زیادہ کڑی ہے۔ اگر اس الجھن کو برداشت کر کے وہ آگے بڑھ گیا تو قرآن اس سے خود قریب ہونے لگتا ہے۔ اس کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے اور بلا کسی واسطے کے اس پر کھلنے لگتا ہے ایک اور نکتہ عرض کر دوں کہ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں ہر عہد کے علماء نے قرآن کو اپنی ضرورت اور اپنے ماحول کے مطابق پڑھنے، سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مفسر کا رنگ جدا نظر آتا ہے اور بعض ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کم فہم لوگوں نے اپنے آپ کو قرآن کا تابع بنانے کی بجائے قرآن کو اپنے دعاوی کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میں اپنے نوجوان تعلیم یافتہ احباب کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتا ہوں کے تلاوت قرآن کے ابتدائی مراحل میں اپنے آپ کو کسی مفسر کے حوالہ نہ کریں قرآن کا کوئی اچھا ترجمہ اپنے سامنے رکھیں اور پھر قرن اول کے ایک بدوی کی طرح جو وسط صحرا سے گرد آلود ہاتھ پاؤں کے ساتھ آتا تھا اور قرآن کی ایک آیت سن کر منطق و فلسفہ معانی و بیان، علم کلام و اصول تفسیر سے ناواقفیت کے باوجود، ایمان کے نور سے منور ہو کر واپس جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کا ترجمہ اور ان کی تفسیر موضح القرآن زبان اردو کی غرابت اور متروک محاوروں کے باوجود آپ کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ (مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۷۴، ۷۵)

ایک دوسرے مکتوب نگار جناب مولوی سید محمود عالم، ریلوے انجنیر اسٹیشن قاضی پیٹ نے قرآن و حدیث اور فقہ سے واقفیت حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کیا تو بہادر یار جنگ نے ۲۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو انھیں جواب دیا کہ۔ "قرآن و حدیث اور فقہ سے ناواقفیت نہایت آسانی سے رفع ہو سکتی ہے۔ اگر آپ روزانہ تھوڑا وقت اخبار بینی اور مطالعہ کے سلسلہ میں چند مذہبی کتابوں کے مطالعہ پر صرف کر سکیں۔ عربی دانی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے اردو میں ہر طرح کا مواد جمع ہو چکا ہے۔ چند کتابوں کی طرف اس توقع پر اشارہ کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ کبھی آپ کو وقت مل جائے۔

"(۱) ترجمان القرآن (تفسیر قرآن مجید تحریر کردہ مولانا ابوالکلام آزاد) خصوصاً اس کا مقدمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر آپ کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

(۲) سیرۃ النبی مولفہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم و تکمیل کردہ مولانا سید سلیمان ندوی، اس کی چھ ۶ جلدیں (اب ساتویں بھی) شائع ہوئی ہیں اور یہ کتاب اصول و فروع اسلام سے آپ کی

واقفیت کے لئے کافی ہے۔

(۳) خطبات مدراس یعنی مولانا سلیمان ندوی کے مدراس والے لکچرز کا مجموعہ چھوٹا سا رسالہ ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اس سے بہتر تبصرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

فی الحال ان تین کتابوں کی طرف توجہ کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے بعد کسی اور چیز کی بہت کم ضرورت باقی رہ جائیگی۔ (مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۱۴۴، ۱۳۴)

ایک دفعہ قرآن فہمی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ "سیرت طیبہ پر غائر نظر ڈالے بغیر قرآن کی حقیقی فہم حاصل نہیں ہو سکتی"۔ (بہادر یار جنگ، مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۲۸۲) ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ قرآن کی بامعنی و مطلب تلاوت ہی کو میں صحیح تلاوت سمجھتا ہوں۔ جو سورتیں قرآن شریف کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہیں، اگر یاد کرتے وقت ہی ان کے معنی پر غور کرلیا جائے تو کچھ دشوار نہیں (مکاتیب صفحہ ۶۸) ممتاز صحافی ابراہیم جلیس مرحوم کا بیان ہے کہ ۱۹۳۱ء میں بہادر یار جنگ بلاد اسلامیہ کے سفر کے دوران قاہرہ بھی تشریف لے گئے۔ اس وقت مصریوں کو ہندی مسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ کلام پاک کا ترجمہ کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ چنانچہ جامعہ ازہر کے پرنسپل صاحب نے بڑے طنزیہ لہجے میں نواب صاحب سے کہا "آپ ہندوستانی مسلمان تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں"۔۔۔ نواب صاحب طنز کو فوراً بھانپ گئے لیکن بغیر برا مانے نہایت شگفتگی سے بولے: جناب! ترجمہ تو نہیں البتہ ترجمانی ضرور کرتے ہیں اور ترجمانی میں یقیناً کوئی قباحت نہیں ہے"۔ (بہادر یار جنگ، مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۴۳)

بہادر یار جنگ قرآن میں غور و فکر کے تو عادی تھے ہی، اس کے معنی و مفہوم کو عام کرنے کی جہد مسلسل اور سعی پیہم میں بھی وہ مصروف تھے۔ اس کے علاوہ فن تجوید و قرات سے بھی مناسبت تھی اور یہ فن انھوں نے باضابطہ قاری روشن علی صاحب رح سے حاصل کیا تھا اور اس فن سے اس درجہ واقف تھے کہ اکثر قاری صاحب مرحوم سے داد حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے پھر اس فن سے دلچسپی بھی اس قدر تھی کہ ہر سال شب قدر میں قرات کا جلسہ اپنی ڈیوڑھی میں منعقد کیا کرتے، جس میں ملک کے بڑے بڑے اہل فن مدعو کئے جاتے اور قراء ت سبع و فن تجوید کے سلسلہ میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے خود نواب صاحب مرحوم اس میں حصہ لیتے اور قراءت خوانی کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔ اس دلکش اور اثر آفریں منظر کو باذوق نظرین دیکھ کر اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہوئے لطف اٹھائیں۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن   قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآں۔

بچپن کی تربیت اور قرآن سے مسلسل ربط و تعلق اور اس میں انہماک و شغف نے نواب بہادر یار جنگ کا جو مزاج بنایا تھا اور "غیب" سے "شہود" کی جس منزل میں وہ داخل ہوگئے تھے اس وقت کا ایک واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔ ابراہیم جلیس مرحوم کا بیان ہے کہ ایران کے

------------ تہران میں انھیں کسی مقام تک جانا تھا۔ انھوں نے سڑک پر ایک ٹیکسی روکی اور ٹیکسی ڈرائیور ------------- "فلاں مقام تک کا کیا لوگے ؟"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا، آپ کتنے آدمی ہیں ؟"۔ بہادر یار جنگ اکیلے تھے لیکن فرمایا" دو"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فی کس کرایہ بتا دیا تو بہادر یار جنگ نے فرمایا" کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن چلیں گے دو"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کیا" میں تو نہیں لے جاؤں گا"۔ نواب صاحب نے اصرار فرمایا" میں اور میرا ساتھی ضرور جائیں گے لیکن کرایہ ایک ہی کا ملے گا"۔ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے بھی لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا" بھیا، میرا خدا میرے ساتھ ہے کیا خدا کا بھی کرایہ لوگے ؟"۔(بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۴۴، ۴۳)

یقیناً بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو قرآن سے شغف رکھتے ہیں۔ اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ اس میں غور کرتے ہیں اور اس کی بتائی ہوئی راہ کو اپناتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو ایک حدیث میں" سب سے بہترین" قرار دیا گیا ہے اور دوسری حدیث میں" خاصان خدا" کا محبوب لقب عطا فرمایا گیا ہے پس کون مومن ہو گا جس کے دل میں قرآنی شغف اور خدمت کے ذریعہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی طرح" خاصان خدا" میں شامل ہونے کی آرزو نہ ہو یہ شعر کس قدر صحیح اور بہادر یار جنگ مرحوم کی زندگی سے ہم آہنگ ہے کہ:

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

مفسر قرآن مولانا ابو محمد مصلح مرحوم (ادارہ عالمگیر تحریک قرآن حیدرآباد) نے قرآن کے بارے میں خوب کہا ہے۔

غیروں کی مصلح پستی پر اور اپنی غافل ہستی پر
کرنا ہے تمہیں احسان اگر، قرآن پڑھو، قرآن پڑھو

خالد سیف اللہ رحمانی

سوال و جواب

مولانا میر الیاس علی قاسمی امریکہ میں مقیم ہیں، انہوں نے مدیر "صفا" کے نام ایک سوالنامہ بھیجا تھا، اسی کا جواب عام قارئین کے فائدہ کیلئے ذیل میں نقل کیا جارہا ہے

(ادارہ)

انشورنس کمپنی کے ذریعہ ہرجانہ کی ادائیگی

زید کی کار کو بکر نے ٹکر دیدی اور زید کی کار کو نقصان بھی ہوا، اب اس کی تلافی بکر کے ذمہ ہے، لیکن انشورنس پالیسی کی وجہ سے بکر اس کا نقصان اپنی ذاتی رقم سے پورا نہیں کرتا، بلکہ انشورنس کمپنی ادا کرتی ہے، جس کو بکر ماہانہ ایک متعینہ رقم ادا کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا انشورنس جائز ہے؟ صورت ہذا میں انشورنس کمپنی کے ذریعہ تلافی کے سوا دوسری کوئی صورت نہیں اور زید اتنا متحمل نہیں کہ بکر کی رقم معاف کردے، تو کیا ایسی صورت میں زید اپنی کار کے نقصان کی تلافی بکر کی طرف سے انشورنس کمپنی کے ذریعہ کرواسکتا ہے؟ اور کار کے بغیر زید کے کاروبار نہیں چل سکتے، ثانیاً اگر زید مستطیع ہے تو کیا وہ اپنا حق چھوڑ سکتا ہے اور بکر کو معاف کرسکتا ہے؟ شرعی گنجائش یا عدم گنجائش جو بھی صورت ہو تو قرآن و حدیث یا فقہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: اگر امریکن قانون کے لحاظ سے موٹر کے مالکان کے لئے انشورنس پالیسی ضروری ہو جیسا کہ ہندوستان میں ہے اور غالباً امریکہ وغیرہ میں بھی ایسا ہی قانون ہے، تو انشورنس کے جواز اور عدم جواز سے قطع نظر ایک قانونی مجبوری کے تحت پالیسی میں شرکت جائز ہوگی اور جب انشورنس کمپنی حادثات کا ہرجانہ ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے تو یہ گویا فقہ کی اصطلاح میں حوالہ ہے۔ گاڑی کے مالک کی حیثیت محیل اور انشورنس کمپنی کی حیثیت محتال علیہ کی ہے اور جس کو حادثہ ہوا ہے اس کی حیثیت محتال کی ہے، اس لئے میرے خیال میں انشورنس کمپنی سے تاوان دلانا اور ان کا تاوان لینا جائز ہے۔ زید تاوان نہ لینا چاہتا ہو، تو چونکہ ہر انسان کو اپنا حق معاف کرنے کی

گنجائش ہے، اس لئے معاف کر سکتا ہے۔

شہری اور نیم شہری وظیفہ

امریکن گورنمنٹ کا قانون ہے کہ امریکن شہری (سیٹیزن) یا امریکن ایمیگرنٹ (نیم شہری) خواہ مرد ہو کہ عورت، اگر بے روزگار ہے، یا عمر ۶۵ سال سے متجاوز ہے اور ذرائع آمدنی نہیں ہیں تو درخواست دینے پر محکمہ سوشیل سیکوریٹی کی طرف سے انہیں ماہانہ اوسطاً دو تا تین سو ڈالر وظیفہ پیرانہ سالی یا وظیفہ بے روزگاری کے عنوان سے دیا جاتا ہے اور اس محکمہ کی آمدنی تمام ملازمین حتیٰ کہ ہوٹل کے ادنیٰ ملازم کی تنخواہوں میں سے ٹیکس کے عنوان سے وضع شدہ رقم ہوتی ہے، اور وظیفہ خواروں میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہوں نے امریکہ میں ملازمت کی ہو اور وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسرے ممالک سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور گرین کارڈ حاصل ہونے کے بعد مذکورہ اعذار کی بنا پر حکومت سے امداد کے طالب ہوتے ہیں جنہوں نے امریکہ میں کوئی ملازمت یا خدمت نہیں کی اور نہ ان کی تنخواہوں سے کوئی پیسہ وضع ہوا، کیا دوسرے زمرہ کے لوگوں کے لئے جنہوں نے کوئی کام امریکہ میں نہیں کیا، ان کے لئے یہ رقم جائز ہے، قرآن وحدیث یا فقہ اسلامی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: شہری یا نیم شہری کے لئے حکومتِ امریکہ جو وظیفہ جاری کرتی ہے وہ جائز ہے، اور حکومت کی طرف سے اپنے غریب و نادار شہریوں کے لئے اعانت ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ایسے لوگوں کے لئے بیت المال سے وظیفہ جاری کیا تھا، فقہاء نے بھی ملک کی دفاعی ضرورت یا دوسری اجتماعی ضروریات کے لئے عوام کے متمول اور برسر روزگار شہریوں پر ٹیکس (ضریبہ) عائد کرنے کی اجازت دی ہے۔

چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں:

واذا خلت الایدی من الاموال ولم یکن من مال المصالح مایفی بخراجات العسکر...... جاز للامام ان یوظف علی الاغنیاء مقدار کفایۃ الجند۔ (المستصفی ۱/۳۱۳)	جب بیت المال خالی ہو جائے اور صیغۂ مصلحت کی آمدنی باقی نہ رہے، جو فوج کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے، تو امام المسلمین کے لئے جائز ہے کہ اغنیاء پر فوج کی کفایت کے بقدر ٹیکس لگایا جائے۔

امام ابو اسحاق شاطبیؒ کا بیان ہے:

انا اذا فرضنا اماما مطاعا مفتقرا الی تکثیر الجنود لسد حاجة الثغور وحماية الملك المتسع الاقطار وخلا بيت المال وارتفعت حاجة الجند الی مال یکفیهم فللامام اذا كان عدلا ان یوظف علی الاغنیاء مایراه کافیا لهم فی الحال۔

(الاعتصام ۲/۱۲۱)

اگر مقررہ امام قابلِ اطاعت فوج میں اضافہ کا محتاج ہو تاکہ سرحدوں کی ضرورت، ملک کے وسیع علاقوں کی حفاظت کی جا سکے اور صورتِ حال یہ ہے کہ بیت المال خالی ہو اور فوجی ضروریات مزید اخراجات کے متقاضی ہوں تو امام اگر عادل ہو تو گنجائش ہے کہ اغنیاء پر ٹیکس لگایا جائے جو ان ضروریات کے لئے کافی ہو جائے۔

خود صاحبِ ہدایہ کی عبارت سے بھی یہ بات مترشح ہے:

فان ارید بها مایکون بحق ککری النهر المشترك واجر الحارس والموظف لتجهيز الجيش وفداء الاساری وغیرها جازت الكفالة بها علی الاتفاق۔

(هدایه ۳/۱۰۹، باب: کفالة)

اگر نوائب سے وہ مراد ہیں جو کسی حق کی بنا پر ہو، جیسے مشترک نہر کی کھدائی، چوکیدار کی اجرت، فوج کی تیاری کے لئے مقررہ ٹیکس، قیدیوں کی رہائی کا فدیہ، تو بالاتفاق اس کی کفالت جائز ہے۔

خرید و فروخت کی ایک صورت

یہاں یہودیوں کی ایسی کمپنیاں ہیں جو خواہش مندوں کو CAB.S (ٹیکسی کاریں) آسان اقساط پر دیتے ہیں، لیکن اپنی قومی فطرت کی بناء پر اس پر سود لیتے ہیں، مثلاً ... ۴۰ ڈالر اصل قیمت ہے تو اس پر جملہ تین ہزار ڈالر سود پوری رقم ادا ہونے تک وصول کر لیتے ہیں، اس طرح مشتری کو پوری گاڑی ... ۷ ہزار میں ملتی ہے، لیکن اب مسلمان ڈرائیورس سود کے معاملہ کی وجہ سے ان کمپنیوں کی کاریں نہیں خرید رہے ہیں، لیکن جب یہودیوں نے دیکھا کہ مسلمان نہیں خرید رہے ہیں تو انہوں نے سود کا نام نکال دیا، اب گاڑی کی قیمت بغیر سود کے ... ۷ ہزار میں فروخت کرتے ہیں، لیکن سازشی فطرت کی بناء پر سود کا لیبل نکال دیا ہے، کیا ایسی صورت میں گاڑی خرید سکتے ہیں؟ خریدنے والا سود میں ملوث قرار پائے گا؟ جب کہ وہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ بلا سودی CAB.S خریدئیے۔

جواب: شریعتِ اسلامی میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ آدمی کوئی چیز نفع کے ساتھ فروخت کرے۔ اس نفع کے لئے اخلاقی حدود قائم کی گئیں، کہ نفع اتنا زیادہ نہ ہو کہ بازار کے عام نرخ کے لحاظ سے صریحًا زیادہ ہو، جس کو شریعت کی زبان میں "غبنِ فاحش" کہا جاتا ہے، لیکن اس کے لئے کوئی قانونی تحدید نہیں کی گئی ہے، اس لئے تیرہ ہزار میں فروخت ہونے والی گاڑی سترہ ہزار میں فروخت ہوسکتی ہے، نیز اگر ایک شخص کسی سامان کو اس طرح فروخت کرلے کہ نقد اتنی قیمت اور ادھار اتنی قیمت ہوگی، تب تو جائز نہیں، کہ اس میں قیمت کی تعیین نہیں ہو پاتی ——— رجل باع علی انه بالنقد بکذا او بالنسیئة بکذا او الی شهر بکذا او الی شهرین بکذا لم یجز کذا فی الخلاصة۔ (هندیه - ۳/۱۳۶)

لیکن اگر کوئی شخص ادھار بیچے اور نقد کی معمول کی قیمت سے زیادہ مقرر کرلے تو یہ صورت جائز ہے، لہٰذا ایسی موٹر کا خرید کرنا جائز ہوگا۔

ہسپتال میں نمازِ جمعہ

یہاں چونکہ مساجد بہت دور دور کے فاصلہ پر ہوتی ہیں، بسا اوقات جمعہ کی نماز کے لئے تقریبًا ایک گھنٹہ کی DRIVE کرکے آنا پڑتا ہے، اس طرح سے دو گھنٹہ کا کام متأثر ہو جاتا ہے، اور اگر ڈاکٹرس ہوں تو وہ اپنے مریضوں سے دور نہیں رہ سکتے اور نہیں کمپنی کا ذمہ دار یا دواخانہ کا سرجن اس کی اجازت دیتا ہے، اس لئے دواخانہ میں موجود دو چار مسلم ڈاکٹرس کسی صاف جگہ ہسپتال میں ہی جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں، انہیں میں سے کوئی ایک ڈاکٹر، جو غیر اسلامی وضع قطع اور انگریزی لباس میں ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ نماز و خطبہ کے مسائل اور اصولِ تجوید سے ناواقف ہوتے ہیں خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے ہیں۔ اور اگر اس طرح پر جمعہ کی نماز نہ ادا کی جائے تو یہ لوگ مستقل طور پر تارکِ جمعہ کہلائیں گے، اور وہ کسی دیہات میں بھی نہیں ہوتے کہ انہیں فرضیتِ جمعہ سے سبکدوش کردیا جائے۔ ویسے ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب مرکزی مسجد کو جمعہ کی نماز کے لئے پہونچ جاتے ہیں۔ کیا ملازمت کی اس مجبوری سے نمازِ جمعہ ان سے ساقط ہوسکتی ہے، اگر نہیں تو وہ ہسپتال میں مذکورہ صورت میں پڑھ سکتے ہیں؟ اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے، جوابِ باصواب سے مطلع فرمائیں۔

جواب: فقہائے احناف کے نزدیک جمعہ صحیح ہونے کے لئے ایک شرط اذنِ عام بھی ہے، اذنِ عام کا

مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کو وہاں آنے اور نماز میں شرکت کرنے کی اجازت حاصل ہو، چنانچہ کسی مکان میں بھی اگر جمعہ قائم کیا جائے اور آنے والے کے لئے دروازہ کھول دیا جائے تو چاہے لوگ آئیں یا نہ آئیں جمعہ قائم کرنا درست ہوگا۔

وکذالك السلطان اذا اراد ان یجمع بحشمه فی داره فان فتح باب الدار واذن اذنا عاما جازت صلاته شهدها العامة اولم یشهدوها کذا فی المحیط۔ (ھندیہ ۱/۱۴۸)

اگر گیٹ بند رکھا جائے، دربان مقرر ہوں اور عام لوگوں کو شرکت کی اجازت نہ ہو تو جمعہ کا قیام درست نہ ہوگا: وان لم یفتح باب الدار واجلس البوابین علیها لم تجزلهم الجمعة کذا فی المحیط (ھندیہ ۱/۱۴۸)

اس تفصیل کی روشنی میں اگر اذن عام ہسپتال میں نہ ہو تو احناف کے مسلک پر مذکورہ صورت میں جمعہ کا قیام درست نہ ہوگا ______ البتہ فقہاء نے مریض کی طرح تیماردار کے لئے بھی جمعہ چھوڑنے اجازت دی ہے:

والحق بالمریض الممرض ان لقی المریض ضائعا بخروجه علی الاصح ______ (طحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۲۷۵)

یہی بات حصکفیؒ اور علامہ شامی نے بھی لکھی ہے، (ملاحظہ ہو: رد المحتار، ج ۱، ص ۵۴۷)

اس لئے ان ڈاکٹر حضرات کے لئے جمعہ چھوڑنے کی گنجائش ہے اور ظہر کی نماز پر اکتفا کر سکتے ہیں، دوسرے فقہاء کے ہاں گو اذنِ عام شرط نہیں، لیکن امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک چالیس افراد کے بغیر جمعہ منعقد نہیں ہوسکتا۔ ولاتنعقد الجمعة الا بأربعین عند الشافعیؒ واحمدؒ (رحمة الامة، ص ۴۳)

امام مالکؒ کے نزدیک امام کے علاوہ کم سے کم بارہ آدمی ہونے چاہئیں: الثانی: حضور اثنی عشر غیر الامام۔ (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، ج ۱، ص ۳۸۱) اس لئے ان فقہاء کی رائے پر بھی مذکورہ صورت میں جمعہ کا انعقاد نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک انگریزی لباس میں نماز یا امامت کی بات ہے تو بہتر طریقہ تو یہی ہے کہ صالحین کی وضع کے مطابق لباس استعمال کیا جائے، لیکن لباس خواہ کیسا بھی ہو، اگر جسم کے ان حصوں کا ستر ہو جاتا ہو، جن کو چھپانا نماز کی حالت میں ضروری ہے تو نماز ہو جائے گی اور اس کی امامت بھی نماز کی صحت کے لئے کافی ہوگی، جہاں تک تجوید اور مسائل سے ناواقفیت کی بات ہے تو جب تمام نمازی اسی طرح کے ہوں تو انہیں میں سے ایک کا دوسروں کی امامت کرنا درست ہے، جیساکہ فقہاء نے امّی کے لئے اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ امیوں کی امامت کریں۔ (ھدایہ اول، ص ۱۲۷) ______ البتہ ایسے مسلمانوں کو

چاہئے کہ وہ جلد سے جلد اپنی اس کمی کو دور کرنے کی تدبیر کریں۔

ذبیحہ پر بسم اللہ

یہاں کے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدت پسند کہلاتا ہے، دینی مسائل میں بڑا وسیع النظر ہے، جن کا یہ کہنا ہے کہ جھٹکے کا جانور یعنی غیر ذبیحہ کا گوشت اگر اللہ کا نام لے کر کھائے تو حلال ہے' جب کہ مشین کے ذریعہ جانور کی گردن الگ کر دیتے ہیں، اور اس پر مضحکہ خیز دلائل بھی دیتے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کہ بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ: "اس کو مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو"۔ اس لئے اللہ کا نام پڑھ کر گوشت کھالیں تو اس میں کوئی ممانعت اور خلاف شرع بات نہیں ——— براہ کرم مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے "بسم اللہ" کہنا ضروری ہے، یہ قرآن مجید کی صریح اور واضح آیات سے ثابت ہے، اور کسی متلاشیِ حق کے لئے اس سے مجالِ انکار نہیں، چند آیات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

یشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایامٍ معلوماتٍ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر ہ (الحج ۲۸)

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلنا منسکًا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام ہ (الحج ۳۴)

ان دونوں جگہ "بھیمۃ الانعام" پر "بسم اللہ" کہنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ "بھیمۃ الانعام" سے زندہ جانور مراد ہیں، نہ کہ ان کا کٹا ہوا گوشت۔

والبُدن جعلنٰھا لکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیر فاذکروا اسم اللہ علیھا صوآف فاذا وجبت جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر ہ (الحج ۳۶)

یہاں بھی اونٹوں پر ذبح کے وقت صف بستہ حالت میں بسم اللہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جب ذبح کے بعد جانور گر جائیں تب کھانے اور کھلانے کا حکم ہے اور اس طرح کی اور بھی متعدد آیات موجود ہیں' اور حدیثیں جو صراحتاً تسمیہ کے ضروری ہونے کو بتلاتی ہیں، اس کے علاوہ ہیں:

لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق (الانعام ۱۲۲) سے کوئی صاحب علم اس بات پر

استدلال نہیں کرسکتا کہ شرعی طریقہ پر جو جانور ذبح نہ کئے گئے ہوں ان پر کھاتے وقت "بسم اللہ" کہہ لینا کافی ہوجائے گا، کیونکہ اگر اس آیت میں کھانے کے وقت "بسم اللہ" کہنا مراد لیا جائے تو ظاہر ہے کہ تسمیہ کا تعلق صرف "لحمیات" سے نہ ہوگا، بلکہ ہر طرح کی غذا سے ہوگا، گویا ہر کھانے پر شروع میں بسم اللہ کہنا واجب قرار پائے گا، کیونکہ آگے "انہ لفسق" کی تعبیر اس سے پہلے کے حکم کے واجب ہونے پر صریح دلیل ہے، اور کوئی بھی کھانے سے پہلے تسمیہ کے وجوب کا قائل نہیں، امام ابوبکر جصاص رازی نے شکار کا جانور چھوڑتے وقت بسم اللہ کو ضروری قرار دیا ہے اور اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ومعلوم ان ذالك امر يقتضى الايجاب وانه غير واجب على الاكل فدل على انه اراد به حال الاصطياد۔ (احکام القرآن ۴/۷)

عدی ابن حاتم کی روایت میں صریحاً موجود ہے کہ کتے کے شکار کے بارے میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ، جب تم اپنے تربیت یافتہ کتے کو چھوڑو اور اس پر بسم اللہ کہو تو اسے کھا سکتے ہو، بشرطیکہ وہ تمہارے لئے شکار کو روک رکھے، اگر کوئی دوسرا کتا بھی شریک ہوجائے تو نہ کھاؤ، اسلئے کہ تم نے اپنے کتے پر بسم اللہ کہا ہے، نہ کہ دوسرے کتے پر: فانما ذكرت اسم الله على كلبك ولم تذكره على غيره۔ (احکام القرآن ۳/۷)

ذبح کے سلسلہ میں مشہور آیت "لا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه" میں خود بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے، کہ ذبیحہ پر ذبح کے وقت "بسم اللہ" کہنا ضروری ہے، کیونکہ آیت میں "من" بمعنی "بعض" وارد ہے کہ بسم اللہ نہ کہی ہوئی چیز کا بعض حصہ بھی نہیں کھا سکتے، اگر پکائی ہوئی چیز پر بسم اللہ کہہ کر کھانا مقصود ہوتا تو "من" بمعنیٰ "بعض" کی ضرورت نہیں تھی تو ارشاد ہوتا: لا تاكلوا مالم يذكر اسم الله عليه ——— یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہے کہ آیت مذکورہ میں، جانور ہی پر بسم اللہ کہنا مقصود ہے۔

بعض حضرات اس روایت سے مغالطہ دیتے ہیں کہ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بعض دیہاتی گوشت پیش کرتے ہیں اور وہ نو مسلم ہیں، معلوم نہیں کہ انہوں نے جانور پر "بسم اللہ" کہا ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا بسم اللہ کہہ کر کھالو ——— یہاں دراصل مقصود یہ ہے کہ مسلمان چاہے ابھی کچھ دنوں پہلے ایمان لائے ہوں، لیکن ان کے عمل کو صواب و سداد پر ہی محمول کیا جائے گا اور یہی توقع رکھی جائے گی کہ انہوں نے احکام شرعیہ کی رعایت کے ساتھ ذبح کیا ہوگا، مزید طمانیت خاطر کے لئے کھاتے وقت "بسم اللہ" کہہ لو۔

جصاص کے الفاظ ہیں:

فلو لم تکن التسمیة شرط الزکوٰة لقال وما علیکم من ترک التسمیة ولکنہ قال کلوا الان الاصل ان امور المسلمین محمولة علی الجواز والصحة۔ (احکام القرآن ۳/۷)

جہاں تک مشینی ذبیحہ کی بات ہے، تو اس کا حکم ذبح کے لئے استعمال کی جانے والی مشین پر موقوف ہے، اصولی طور پر مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (ماہنامہ دار العلوم دیوبند، جون ۱۹۷۸ء) میرا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خبرنامہ : دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

مرتبہ: محمد یعقوب مظہر

صفر کے مہینے میں الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب (صدر مجلس انتظامی جامعہ سبیل السلام) تجار کی جماعت کے ساتھ کرنول کے دعوتی سفر پر گئے۔ اس جماعت میں جامعہ کے صدر مدرس مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب بھی شریک تھے

مورخہ ۳ - ۴ صفر المظفر سنہ ۱۴۱۱ھ کو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (صدر مدرس) نیز مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی (استاذ حدیث) "یاد حسین" کے جلسہ میں شرکت کے لئے کرنول تشریف لے گئے۔ اور خطاب فرمانے کے علاوہ وہاں کے مختلف دینی مدارس اور عربک کالج کرنول کا معائنہ فرمایا

اہل گنٹور کا عرصہ سے تقاضا تھا کہ حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ناظم جامعہ تشریف لے جائیں چنانچہ ۹ - ۱۰ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو آپ نے گنٹور کا سفر فرمایا۔ اور وہاں سیرت کے مختلف جلسوں سے خطاب کیا۔ ان جلسوں میں حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب امارت شرعیہ بہار پھلواری شریف پٹنہ بھی مدعو تھے۔

حضرت مولانا محمد برکت اللہ قاسمی صاحب نے بھی ۹-۱۰-۱۱ ربیع الاول گلبرگہ کا سہ روزہ تبلیغی و دعوتی سفر کیا۔ مختلف مقامات پر آپ کے بیانات ہوئے اور لوگوں نے استفادہ کیا
------- ۶ - ربیع الاول کو موصوف نے مجلس علمیہ کے زیر اہتمام منعقد شدہ "تربیت اساتذہ کیمپ" کو مخاطب کرنے اور اپنے تدریسی تجربات کی روشنی میں اظہار خیال کے لئے کوداڑ تشریف لے گئے۔ اور وہاں خطاب فرمایا۔

جامعہ ہذا میں امتحان ششماہی ۱۴-تا۱۹- ربیع الاول کو منعقد ہوا۔ ۳۸۷ طلباء نے شرکت کی۔ مجموعی اعتبار سے درج ذیل طلباء امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے

شعبہ عالمیت	ارشد قمر (سوم عربی) مجموعی اعتبار سے ----اول
-----	نوشاد علی، عتیق الرحمن (چہارم عربی) مجموعی اعتبار سے ----دوم
-----	احمد حسین (سوم عربی) مجموعی اعتبار سے ----سوم
شعبہ تحفیظ القرآن	محمد سفیان---- مجموعی اعتبار سے اول

-----	محمد راغب---- مجموعی اعتبار سے دوم
-----	انصار اللہ--- مجموعی اعتبار سے سوم
شعبہ روضۃ الاطفال:	محمد سید افضل---(ناظرہ) مجموعی اعتبار سے اول
----	تنویر احمد---(اول اردو) مجموعی اعتبار سے دوم
-----	سرفراز عالم--(اول اردو) مجموعی اعتبار سے سوم

۲۵ \ ۲۶ \ ۲۷ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو دہلی میں بابری مسجد کے مسئلہ پر علماء اور دانشوروں کی ایک اہم نشست طلب کی گئی تھی۔ جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا ابوسعود صاحب (بنگلور) مولانا مفتی اشرف علی صاحب، مولانا مختار احمد ندوی (بمبئی) مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور) وغیرہ کے علاوہ حیدرآباد سے مولانا حمید الدین حسامی عاقل، امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش اور جامعہ ہذا سے ناظم مدرسہ اور صدر مدرس صاحب بھی مدعو تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے بھی شرکت کی اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔

۳۔ ربیع الثانی ۱۱ھ کو جناب صلاح الدین صاحب مدرسہ تشریف لائے۔ اور مختلف شعبہ جات کا نیز تعمیری کاموں کا معائنہ فرمایا۔ اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔

۸۔۹ ربیع الثانی ۱۱ھ کو جامعہ ہذا کی شاخ گولکنڈہ میں ششماہی امتحان منعقد ہوا۔ جس جس میں مرکز سے جناب مولانا محمد یاسین قاسمی صاحب بحیثیت نگران امتحان تشریف لے گئے

مورخہ ۱۹۔ ربیع الثانی ۱۱ھ طلبہ دارالعلوم سبیل السلام کا تحریری، تقریری مقابلہ منعقد ہوا مختلف شعبوں میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کے نام درج ذیل ہیں۔ بیت بازی میں دونوں گروپ مساوی رہے اور نصف گھنٹہ تک بیت بازی کا سلسلہ جاری رہنے کے باوجود پروگرام غیر مختتم رہا۔

قراءت	اول --انور حسین (ہفتم عربی)
--	دوم-- محمد امجد (حفظ)
-----	سوم-- محمد یونس، محمد شفیع (حفظ)
مقالہ نویسی	اول---شباب الدین (ششم عربی)
-----	دوم--- منصور انور، حافظ محمد امتیاز، محمد انظر (ہفتم عربی)
-----	سوم--- عبدالودود (پنجم عربی)

تقریر اردو عربی:	اول --- حافظ مصلح الدین، حافظ عبدالحفیظ (ہفتم عربی)
-----	دوم --- عبدالرحمن (ہفتم عربی) محمد وجاہت علی (پنجم عربی)
-----	سوم --- عظمت اللہ (ششم عربی) عبدالجبار (دورہ حدیث)
نعت:	اول --- محمد عارف (اول عربی)
-----	دوم --- نورالدین (سوم عربی) کبیر احمد (حفظ)
-----	سوم --- سیف اللہ (ہفتم عربی)

۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۱ھ مجلس علمیہ آندھراپردیش کے دستور پر نظر ثانی کے لئے جامعہ ہذا میں خصوصی نشست منعقد ہوئی۔ اس موقع سے مولانا عبدالعزیز صاحب ناظم مجلس علمیہ، مولانا سید اکبرالدین قاسمی صاحب "نائب ناظم"، مولانا سید اکبر صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا سمیع الدین صاحب اور مفتی امان اللہ صاحب تشریف لائے۔ جامعہ ہذا سے بھی حضرت ناظم صاحب جناب صدر مدرس صاحب اور مولانا محمد برکت اللہ قاسمی اس دستور ساز کمیٹی کے رکن تھے۔

۹۔ جمادی الاولی ۱۱ھ کو جناب محمد طارق غازی صاحب مینیجنگ ایڈیٹر "سعودی گزٹ" تشریف لائے۔ اور مدرسہ کے تعلیمی شعبہ جات اور تعمیری کام کا معائنہ کیا۔ تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الدعوہ کے طلباء کے کام اور طریقہ کار کو تفصیل سے دیکھا اور اس پر اپنے اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا۔

۱۳۔ جمادی الاولی کو شہر حیدرآباد میں مجلس علمیہ کا اہم اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں جامعہ ہذا سے ناظم صاحب صدر مدرس صاحب، مولانا محمد برکت اللہ قاسمی اور مولانا مفتی عبدالودود صاحب استاذ حدیث نے شرکت فرمائی۔ اس موقع سے حضرت ناظم صاحب اور جناب صدر مدرس صاحب نے ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں اظہار خیال بھی فرمایا۔

ادھر دو ماہ سے شہر حیدرآباد اپنی تاریخ کے سب سے بڑے فرقہ وارانہ فساد کا شکار رہا۔ اور سینکڑوں لوگوں کی جانیں اس میں ضائع ہوئیں۔ مالی نقصان کا صحیح اندازہ کرنا تو مشکل تھا۔

اس بار یہ فساد مضافات کے دیہاتوں تک پھیل گیا۔ اور خود جامعہ ہذا کے قریبی محلہ جات بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے حیدرآباد کی مختلف نمائندہ تنظیموں نے ایک مشترکہ ریلیف کمیٹی قائم کی تاکہ متاثرین کی مدد کی جاسکے۔ حضرت ناظم صاحب بھی اس کمیٹی کے رکن ہیں۔ آپ نے مختلف نمائندہ شخصیتوں کے ساتھ شہر اور مضافات کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ بھی فرمایا۔

اس بات کا اظہار بھی مناسب ہوگا کہ موصوف نے موجودہ فسادات اور اس کے سدباب کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ جو دور رس اثرات کے حامل ہوں۔ اس پر ایک نہایت مفید تحریر جو ۲۸ نکات پر مشتمل ہے مرتب فرمائی جو روزنامہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہوئی اور اس کو ملک کے مختلف رسائل و جرائد نے نقل کئے۔ اور مختلف اہل علم اہل دانش نے ان تجاویز کی تحسین کی۔

شہر کے حالیہ فسادات کے سلسلہ میں صحیح حالات سے آگاہی کی غرض سے حضرت مولانا نظام الدین صاحب ناظم امارت شرعیہ (پٹنہ) حیدرآباد تشریف لائے۔ اس موقع سے ۱۶۔ جمادی الثانیہ کو جامعہ ہذا بھی آئے۔ رات میں یہیں قیام فرمایا۔ شعبہ تخصص کے طلبہ کے مضامین اور دوسرے کاموں کو بنظر غائر دیکھا۔ اور غایت درجہ اطمینان کا اظہار فرمایا۔ نیز ۱۷۔ جمادی الثانیہ کو بعد نماز فجر طلباء سے خطاب بھی فرمایا۔

مورخہ ۱۴۔ جمادی الثانیہ کو فرقہ وارانہ فسادات کے بعد امن و سکون کی بحالی کی غرض سے جامعہ کے قرب وجوار میں مواضعات کے ہندؤں اور مسلمانوں نے مل کر قیام امن کے لئے ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا۔ جس میں جامعہ سے صدر مدرس صاحب بھی شریک رہے اور خطاب کیا۔ موصوف بھی اس علاقہ کے امن کمیٹی کے رکن ہیں۔

مبلغ جامعہ حافظ عبدالرشید صاحب جو اس سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ "مسجد ارقم" دارالعلوم سبیل السلام میں سفر حج کے تاثرات بیان کئے۔ اور اس کی عبرت و موعظت کے پہلو نمایاں کئے۔ موصوف نے کہا کہ "حج ایسی عبادت ہے جو جوانی میں ادا کی جانی چاہیئے۔ آپ نے سعودی حکومت کے جذبہ خدمت اور حجاج کے لئے سہولت بخش انتظامات کی بھی تحسین فرمائی۔ اور وہاں کی موجودہ حکومت وانتظامیہ کے لئے دعائیں کیں۔

مورخہ ۱۰۔ جنوری ۹۱ عیسوی کو صدر مجلس انتظامیہ جامعہ ہذا الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب نے اپنے مکان واقع (حیدر گوڑہ) پر معززین کو مدعو کیا۔ تاکہ شہر کے فرقہ وارانہ حالات پر تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ اس نشست میں جناب پی پرشوتم راؤ صاحب۔ ایم ایل اے (ورنگل) چیرمین آئی۔ آئی۔ سی، جناب خواجہ معین الدین (مالک یونائٹیڈ ٹورسٹ)، جناب سید شوکت حسین سابق (ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن) جناب بابو جابری، جناب قادری پاشاہ اور جناب منہاج الدین فاروقی (مالک کارخانہ زندہ طلسمات) نے شرکت کی۔

الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب نے اس موقع سے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا! کہ حالات کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ متعصب پولیس عہدیداروں کو معطل کیا جائے اور پولیس کے کام میں سیاسی قائدین کی مداخلت کو روکا جائے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اصل مجرمین

قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں۔ نیز ہر محلہ میں چک پوسٹ قائم ہو۔ تاکہ جرائم پیشہ لوگوں پر گہری نظر رکھی جاسکے اور بے قصور، بے تحقیق گرفتاریاں روکی جائیں۔

۲۵۔ جمادی الثانیہ ۱۱ھ کو مولانا محسن عثمانی صاحب پروفیسر جواہرلال نہرو یونیورسٹی و مدیر "دعوت و عزیمت" تشریف لائے۔ اور جامعہ ہذا کے نصاب، تعلیمی شعبہ جات، شعبہ تخصص کی کارکردگی کا بنظر غائر جائزہ لیا۔ اور جامعہ کی ستائش کی۔ خصوصیت سے "صفا" کے علمی معیار اور شعبہ تخصص کے طریق تربیت سے بہت تاثر کا اظہار کیا۔

۲۔ رجب المرجب ۱۱ھ کو مشہور عالم حضرت مولانا محمد صدیق احمد صاحب باندوی دامت برکاتہم تشریف لائے۔ طلباء سے خطاب فرمایا مدرسہ کی کارکردگی اور ترقی و مسرت کا اظہار فرمایا۔

جامعہ ہذا کو فی الحال ایک مہمان استاذ کی حیثیت سے مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب سابق مدیر "الداعی" دیوبند۔ وزارہ اوقاف کویت، کی خدمت سے استفادہ کا موقع حاصل ہے۔ موصوف ۳۔۴ ماہ سے جامعہ میں مقیم ہیں۔ اور تخصص فی الفقہ کے طلبہ کے لئے "محاضرات" کے علاوہ دورہ حدیث کی جماعت میں "مؤطا امام مالک" کا درس بھی دیتے ہیں۔

بحمداللہ تخصص فی الفقہ کا دوسرا سال مکمل ہو رہا ہے۔ اس طرح اس سال چار طلبہ شعبہ کی تکمیل کرپائیں گے۔ ان طلبہ نے دوسرے علمی، تحقیقی کاموں کے علاوہ اصولی مسائل میں نصوص سے اخذ واستنباط کے اصول، مجمل نصوص اور اس کے بیان وتوضیح کے قواعد، نسخ، آثار صحابہ کی شرعی حیثیت، فقہی قواعد جیسے موضوعات پر اپنے مفصل مقالات مکمل کئے ہیں۔

فروعی مسائل میں ان طلبہ نے اسلام کا نظام اوقاف، اسلام کا نظام نفقات، احکام الصیام احکام المیت مرتب کئے ہیں۔

تخصص کی سند کے لئے ان حضرات نے جو موضوعات لئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں---

۱۔ مولوی ظفر عالم ندوی---------التکفیر واصولہ

۲۔ مولوی اشرف علی قاسمی------الذبائح فی الفقہ الاسلامی

۳۔ مولوی جمیل اختر قاسمی-------الاجارہ فی الشریعۃ الاسلامیہ۔

۴۔ مولوی خالد حسین صدیقی-----القواعد الفقہیہ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی۔

جامعہ ہذا میں مورخہ یکم شعبان کو ختم بخاری شریف کی تقریب ہوگی۔ اور ۷۔ تا ۱۲۔ شعبان المعظم ۱۱ھ امتحان سالانہ منعقد ہوگا۔ اخیر سال ہونے کی وجہ سے اس وقت تعلیم اپنے شباب پر ہے۔ اور رات دیر گئے تک اساتذہ وطلبہ مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں۔

****

"صفا" کا خصوصی شمارہ

فقہِ اسلامی نمبر

اس سے پہلے بھی اعلان کیا گیا تھا کہ ۱۱ - ۱۲ شمارہ مشترکہ ہوں گے جن کا موضوع "فقہ اسلامی" ہوگا، لیکن چونکہ فقہی سمینار اب فروری کے بجائے مئی ۱۹۹۱ء میں منعقد ہوگا، اس لئے اسی مناسبت سے اب بارہواں اور تیرہواں شمارہ مشترکہ ہوگا، جس میں فقہ، اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کی تاریخ اور اہم فقہی شخصیات کا ذکر ہوگا۔ فقہ اسلامی کے ماخذ کتاب اللہ، سنّتِ رسولؐ، اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، عرف و عادت، استصحاب اور سدِّ ذرائع وغیرہ پر بصیرت افروز مقالات شریک ہوں گے، فقہ اسلامی پر مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور فقہائے ہند کی خدمات کے تفصیلی خاکے پیش کئے گئے ہیں۔

امید ہے کہ یہ فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں ایک دستاویزی مجموعۂ مضامین ہوگا، جو خریداروں کو رقم خریداری ہی میں مہیا کیا جائیگا۔

منیجر: سہ ماہی "صفا"

دار العلوم سبیل السّلام، پوسٹ بالاپور

حیدرآباد ۵....۵ انڈیا